



مقاصد الاسلام

حصہ اول

تالیف

حضرۃ العلامہ شیخ الاسلام عارف باللہ مولانا الحافظ خان بہادر

محمد انوار اللہ فاروقی

فضیلت جنگ قدس اللہ سرہ العزیز بانی جامعہ نظامیہ



ایمان اور تمدن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین و الصّلوۃ والسّلام علی سیدنا محمد و الہ واصحابہ اجمعین

امابعد: یہ امر پوشیدہ نہیں کہ انسان مدنی الطبع ہے یعنی آدمیوں کی طبیعت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ مثل حیوانات کے جنگل میں تنہا اقامت نہیں کرسکتے بلکہ چند ابنائے جنس ملکر ایک بستی آباد کرلیتے ہیں مگر چونکہ طبایع مختلف ہوتے ہیں اور اکثر طبیعتوں میں خودغرضی، تکبراور ظلم و تعدِّی ہوا کرتی ہے اس وجہ سے تمدن اکثر خطرناک حالت میں رہا کیا جسکی اصلاح کے لئے حکما نے بھی قواعد ایجاد کئے۔ اور انبیائے سابق بھی اس کے متعلق کچھ نہ کچھ احکام سنایا کئے۔ مگر جب ہمارے نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے تو آپ نے اِس طور پر تمدن کی اصلاح فرمائی کہ اگر اس پرعمل کیا جائے تو تمام بندگان خدا ہر شہر وقریہ میں نہایت آسایش سے زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ اگرچہ اسلامی کتابیں مسائل تمدن سے بھری ہوئی

ہیں مگر ہر شخص ان پر مطلع نہیں ہوسکتا اس لئے میں چاہتا ہوں کہ مختصر طور پر اسلامی تمدن کا کچھ حال لکھوں جس سے شائقین علم کو معلوم ہو جائے کہ ہمارے دین نے اس باب میں کیسے مستحکم اصول قایم کر دیئے ہیں کہ قیامت تک ٹوٹ نہیں سکتے وما توفیقی الا باللہ۔

واضح رہے کہ پہلا قدم اصلاح تمدن میں ایمان ہے۔یعنی اس بات کی تصدیق کہ خدائے تعالیٰ ایک ہے اس نے محمد ﷺ کو نبی بنا کر ان پر قرآن نازل فرمایا جس میں ہمارے نفع و نقصان کے کل ابواب مذکور ہیں اگر ہم نبی ﷺ کی پیروی کر کے اچھے کام کریں تو جنت کے مستحق ہونگے اور بُرے کام کریں تو دوزخ کا استحقاق ہوگا اور یہ دونوں گھر ہماری جزا و سزا کیلئے خالق عزوجل نے تیار کر رکھے ہیں۔

ایمان کا جو لفظ لکھا گیا دیکھنے کو تو بہت چھوٹا اور معمولی لفظ ہے جسکو ہر شخص جانتا ہے مگر اُس کے معنی ایسے وسیع ہیں کہ اگر ان کی تشریح کی جاے تو ایک مستقل رسالہ ہو جائے گا اور ایسے دقیق مباحث پیش ہو جائیں گے کہ ان کا سمجھنا سمجھانا دشوار ہوگا اس لئے ہم یہاں صرف اس کے لغوی معنے بیان کر دیتے ہیں جس کو ہر طالب علم جانتا ہے کہ وہ امن سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی امن دینے کے ہیں اور ظاہر ہے کہ اصلاح تمدن کا مدار امن

کے قایم رکھنے پر ہے اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ خود لفظ ایمان سے ثابت ہے کہ اصلاح تمدن لوازم ایمان سے ہے یعنی جب ایمان کے معنے پورے طور پر متحقق ہوجائیں تو امن وامان کا تحقق ہوگا جس سے خود تمدن کی اصلاح ہوجائے گی مگر یہ بات بادی الرائے میں سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک کہ تمدن کی حقیقت نہ معلوم ہواس لئے ہم پہلے اس کو مختصر طور پر بیان کرتے ہیں اگراس میں غور وتدبر سے کام لیا جائے تو امید کی جاتی ہے کہ اہل انصاف پر ہمارا دعویٰ مُبرہَن ہوجائے گا۔

یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ آدمی کو جس قدر حاجتیں لگی ہوئی ہیں اور کسی میں نہیں پائی جاتیں دیکھئے جب وہ اپنا تنگ وتاریک اور گرم مقام چھوڑ کر اس وسیع میدان عالم میں قدم رکھتا ہے تو بظاہر اس کے تن برہنہ پر سرد ہوا کا صدمہ جس کو ساری عمر میں کہیں نہیں دیکھا تھا ایسی اذیت پہونچا تا ہے کہ بے اختیار رودیتا ہے۔ کیونکہ مثل اور حیوانوں کے اس کے جسم پر بال ہوتے ہی نہیں جو پشمینی لباس کا کام دیں۔اس وقت کی حالت اس کی قابل رحم اور عبرت خیز ہے کہ اس عالم میں آنے کی کشمکش سے اس نے ہنوز دم نہیں لیا تھا کہ اس عالم کی ہوا لگتے ہی ایک احتیاج اُس پر ایسی مسلط ہوگئی کہ اس کو رُلا کر چھوڑا پر ایک مدت دراز تک نہ کہیں جاسکتا ہے نہ مثل

حیوانوں کے پھر سکتا ہے بستر ناتوانی پر پڑا ہوا بھوک اور پیاس کے صدموں سے رورو کر گھڑی گھڑی اپنی حاجت کو بیان کرتا رہتا ہے۔ پھر ایک مدت کے بعد جب غذا بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے تو اس وقت بھی خودمختاری سے مثل جانوروں کے کوئی چیز کھا نہیں سکتا اور اگر کھا بھی لیا تو معدہ میں صلاحیت نہیں کہ مثل جانوروں کے گھاس وغیرہ کو ہضم کر سکے۔ پھر جب ہوش سنبھالتا ہے اور اپنی ذاتی سعی سے غذا حاصل کرنے کی لیاقت پیدا ہوتی ہے تو اُس کی غذائے طبعی ایسی نہیں جو پیش پا افتادہ ہو اور ہر جگہ دستیاب ہو سکے جیسے حیوانات کیلئے مقرر ہے بلکہ ایسے غلوں کی طرف محتاج ہے جن کو خاص طور پر زراعت کر کے حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر اُس کی طبیعت ایسی نازک بنائی گئی کہ مثل حیوانات کے زیر سما گزران نہیں کرسکتا اس لئے گھر کی طرف محتاج ہے پھر اندرونی اور بیرونی اسباب خدا جانے اُس پر کتنے مسلط ہیں جن کی وجہ سے اس کثرت سے امراض اُس کو لاحق ہوتے ہیں جن کی پوری فہرست اب تک قلم بند نہ ہوسکی ہر وقت ایک نئی بیماری کا سامنا ہے اور ایک نئی دوا کی حاجت ممکن نہیں کہ مثل حیوانوں کے باقتضائے طبع اپنا علاج آپ کر سکے اب غور کیجئے کیا ممکن ہے کہ کوئی فرد بشر ان تمام ضروری اشیاء کو اپنی ذاتی کوششوں سے

فراہم کر سکے ہر گز نہیں۔ صرف غذا ہی کو دیکھ لیجئے جس کی ہر وقت ضرورت ہے کہ کس قدر دشواریوں میں رکھی گئی ہے کہ جب تک اپنی ذات سے زراعت نہ کرے کہیں مل نہیں سکتی بخلاف گھاس پتوں کے جو حیوانوں کی غذا ہے کہ باوجودیکہ ہر سال جانور چر کر اس کو فنا کر دیتے ہیں مگر جب نیا سال آتا ہے تو بغیر اس کے کہ کوئی جانور تخم ریزی کرے اور زراعت کی مشقت اُٹھائے، خود بخود پیدا ہوتی ہے اب زراعت کو دیکھئے کہ کتنی چیزوں کی طرف اس میں احتیاج ہوتی ہے ابتداءً ہل بنانے کی ضرورت ہے، جو بغیر لوہے اور لکڑی کے نہیں بن سکتا۔ پھر لوہے اور لکڑی کا حاصل کرنا ہی آسان نہیں اُس کے لئے بھی آلات کی ضرورت ہے پھر وہ آلات بھی بغیر بنائے بن نہیں سکتے ان کا مادہ حاصل کرنا بھی محتاج آلات ہے غرض کہ صرف آلات ہی کا سلسلہ ایک مدت دراز تک اُس کو پریشان کرر کھے گا پھر وہ آلات اگر بن بھی گئے اور غلہ حاصل ہو بھی گیا تو بغیر پکائے کھانے کے لائق نہیں ہوتا کیونکہ اُس کے معدہ میں اتنی حرارت نہیں رہی گئی جو مثل حیوانات کے کچّے غلہ کو پکا کر ہر وقت ہضم کر سکے بلکہ اُس کے ہضم کے لئے یہاں تک بیرونی مدد کی حاجت ہے کہ کئی چیزوں کو پیسنے کی ضرورت ہے اس لئے ظروف وغیرہ کی احتیاج ہوئی پھر اور ظروف

کے بنانے میں بھی وہی دشواریاں درپیش ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس مکان وغیرہ میں جو ضرورتیں اور احتیاجیں لاحق ہوتی ہیں محتاج بیان نہیں ۔ بہرحال انسان کو اتنی کثیر التعداد اشیاء کی طرف احتیاج ہے کہ انکی فہرست لکھنی مشکل ہے بڑے بڑے شہروں میں دیکھئے تو ایک بڑا حصّہ اُن کا اُس کی ضرورتوں کو پوری کرنے والی اشیاء سے بھرا نظر آئے گا۔

غرضکہ ضرورتوں پر تفصیلی نظر ڈالنے سے بداہۃً یہ ثابت ہوتا ہے کہ ممکن نہیں کہ کوئی فرد بشر اپنی ذاتی کوششوں سے اپنی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ پھر بہت سی ضرورتیں ان میں ایسی ہیں کہ جب تک وہ پوری نہ ہوں بقاے شخصی اور بقاے نوعی محال ہے اس لئے ہر وقت بہت سی چیزوں کی طرف احتیاج لگی رہتی ہے۔ اور احتیاج ایسی بُری چیز ہے کہ جب تک وہ رفع نہ ہو بلائے بے درماں کی طرح آدمی پر مسلط رہتی ہے اور ہر وقت اسی سے متعلق خیال لگا رہتا ہے جس سے دوسرا کام تو کیا خیال تک نہیں آسکتا۔ دیکھ لیجئے کہ جب آدمی کو بھوک کی وجہ سے غذا کی احتیاج ہوتی ہے تو وہ جہاں جاتا ہے غذا حاصل کرنے ہی کا خیال لگا رہتا ہے بلکہ وہ خیال سوائے اس مقام کے جہاں غذا حاصل ہوسکے دوسری طرف اُس کو جانے نہیں دیتا۔ اگر اس کے پاؤں میں زنجیر ڈالی جاتی تو ممکن تھا کہ کسی تدبیر

سے اُس کو توڑ کر کہیں چلا جاتا۔مگر اس خیال کی ایسی گراں زنجیر اُس کے پاؤں میں پڑی ہوئی ہے کہ کسی طرف وہ قدم نہیں اُٹھا سکتا اسی پر اور حاجتوں کو قیاس کر لیجئے۔ان حاجتوں نے انسان کو اس قدر مجبور کر دیا کہ ہر ایک شخص دوسرے سے بزبان حال کہہ رہا ہے کہ خدا کیلئے مجھے بچالو ورنہ میں ہلاک ہوا جاتا ہوں۔اس باہمی گفتگو اور احتیاج کا یہ اثر ہوا کہ ہر ایک دوسرے کی ہمدردی پر آمادہ ہو گیا اور سب نے اتفاق کر لیا کہ ایک ایک حصہ زمین کا زراعت وغیرہ ضروریات کیلئے اپنے تصرف میں لے کر چھوٹی بڑی بستیاں بحسب ضرورت آباد کریں چنانچہ اس ہمدردی سے تمدن کی بنیاد پڑی اور ایک ایک کام کی طرف ایک ایک جماعت متوجہ ہوگئی کسی نے لوہا زمیں سے نکالنا اپنے ذمہ لیا۔کسی نے اُس کے آلات بنانے کی طرف توجہ کی کسی نے زراعت کا اہتمام کیا کسی نے لباس وغیرہ کا انتظام کیا۔غرضکہ اپنی اپنی مناسبت طبعی اور مصلحت وقت کے لحاظ سے ایک ایک کام اپنے اپنے ذمہ لیکر سب نے مایحتاج اشیاء کو ہاتھوں ہاتھ فراہم کر دیا۔

ہر چند بظاہر یہ ابتدائی حالت کا نقشہ معلوم ہوتا ہے مگر حالت موجودہ پر غور کیا جائے تو ہر وقت وہ اسی نقشہ کو پیش نظر کر دے گی۔دیکھ لیجئے ذلیل سے ذلیل خدمت خاکروبوں کی ہے۔اگر وہ اتفاق کر کے اس سے دست

بردار ہو جائیں تو تمام شہر میں تہلکہ پڑ جائے اور قدر نعمت بعد زوال کا مضمون پورے طور پر صادق آجائے۔

جب آپ نے دیکھ لیا کہ آدمی بات بات میں محتاج ہے اور اسی احتیاج نے اُس کو شہر بند کر رکھا ہے اور جب تک قید حیات میں ہے اس دائمی حبس سے آزاد نہیں ہوسکتا تو اس مشاہدہ کے بعد بھی اگر کوئی آزادی کا دعویٰ کرے تو کیونکر صحیح سمجھا جائے گا البتہ بہ نسبت انسان کے حیوانات کسی قدر آزادانہ زندگی بسر کر سکتے ہیں کیونکہ ان کی حاجتیں محدود اور بہت کم ہیں مگر اسی آزادی نے ان کو دولت تمدن سے محروم کر کے ایسی کس مپرس حالت میں ڈال رکھا ہے کہ ان کو مار بھی ڈالیں تو کوئی پوچھنے والا نہیں۔

اب دیکھئے کہ کثرت احتیاج ہر چند نقص اور موجب نقص ہے مگر حق تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں اُس کو داخل کر کے اپنے فضل و کرم سے اُسی نقص کو کمال کا سبب بنا دیا جیسے کہ آزادی باوجودیکہ کمال ہے مگر آزادوں کو دے کر ایک نعمت عظمیٰ سے اُن کو ہمیشہ کیلئے محروم رکھا اس لئے کہ ممکن نہیں کہ تمدن پر مجبور کرنے والی حاجتیں ان میں پیدا ہوں اور وہ اُس نعمت تمدن کو حاصل کر سکیں اس کا ثبوت بآسانی یوں ہوسکتا ہے کہ کسی وحشی جانور کو لا کر نہایت لذیذ اور خوش گوار نعمتیں کھلائے اور فاخرہ لباس

پہنائے اور عالیشان آراستہ مکان میں رکھئے پھر ان تمام نعمتوں کا ذائقہ چکھنے کے بعد چھوڑ کر دیکھ لیجئے کہ اُس کو ان چیزوں کی طرف احتیاج ہوتی ہے یا نہیں۔ یہ تو مشاہدہ ہے کہ بندروں کو شہر میں لا کر پرورش کرتے ہیں اور ایک مدت تک انسانوں کی حسن معاشرت کو وہ دیکھتے ہیں باوجود اس کے جب چھوٹتے ہیں تو وہی ان کا ڈالی ڈالی کودنا اور کچّے پکّے پھل کھا جانا تمام دنیا کی نعمتوں سے ان کے نزدیک افضل ہے نہ وہ روٹی پکا سکتے ہیں نہ اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ان میں تمدن کی صلاحیت ہوتی تو آدمیوں کے تمدن کو دیکھ کر تو کوئی شہر آباد کئے ہوتے اس مشاہدہ کے بعد یہ کہنا کیونکر صحیح ہوگا کہ بندر چونکہ بعض اعضا اور حرکات میں انسان کے مشابہ ہیں اس وجہ سے آدمی اُن کی نسل ہے اور صرف دُم جڑ جانے کی وجہ سے اُس کو امتیاز حاصل ہوگیا ہے جیسا کہ آج کل مذہب ڈارویں کے مسئلہ ارتقاء پر زور دیا جا رہا ہے ادنیٰ تامل سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ چند چیزوں میں مشارکت اور مشابہت ہونے سے وحدت نوعی صادق نہیں آسکتی دیکھ لیجئے تمام جمادات نباتات حیوانات اس باب میں شریک ہیں کہ سب کو جسم صورت شکل وغیرہ ہے باوجود اس کے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ سب نوع واحد ہیں بلکہ وحدت نوعی اسی وقت صادق آئیگی کہ صورت نوعیہ اور طبیعت

نوعیہ کئی افراد میں ایسے طور پر پائی جائے کہ دیکھنے والا فی البدیہ کہہ دے کہ وہ سب ایک قسم کی چیزیں ہیں مثلاً جس قسم کا گھوڑا دیکھا جائے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، دیکھنے والا سب کو ایک قسم میں داخل کر دے گا کیونکہ صورت نوعیہ سب کی ایک ہے، گو صورت شخصیہ ہر ایک کی ممتاز ہو۔ اسی طرح جتنے لوازم اور آثار ہیں سب کے ایک قسم کے ہونگے جو طبیعت نوعیہ سے متعلق ہیں۔ اب دیکھئے کہ بندر اور انسان کی صورت نوعیہ میں کسقدر فرق ہے کہ بچہ بھی اگر بندر کو دیکھے گا تو بندر ہی کہے گا یہ نہ ہوگا کہ بعض اعضا کی مشابہت سے اس کو آدمی کہدے۔ اسی طرح انسان اور بندر کے لوازم و احکام میں فرق بین ہے انسان کا بات کرنا اپنے مافی الضمیر کو بذریعہ خط و کتابت وغیرہ دوسرے پر ظاہر کرنا اور تمدن میں ایک دوسرے کی مدد کرنا وغیرہ وغیرہ اس قدر ہیں کہ بندروں میں ہرگز نہیں پائے جاتے۔ اگر بندر بھی نوع انسانی میں داخل ہوتا تو اس کی ضرورتیں اور احتیاجیں جو طبیعت نوعیہ سے متعلق ہیں اس کو تمدن پر مجبور کرتیں اور بمقتضائے ہمدردی معاونت باہمی سے حصّہ لیتا حالانکہ بداہتہً ثابت ہے کہ جس قدر نوع انسانی کو ضرورتیں اور حاجتیں لاحق ہیں بندروں میں ان کا وجود نہیں۔

فن فرنیالوجی میں لکھا ہے کہ حکمائے سابق نے غلطی کی، جو انسان کو حیوانوں کے رتبہ سے از حد بڑھایا، اور روح کو انسان کے ساتھ مختص کیا، اور تمام قوتوں کو روح سے متعلق کر دیا اور خیال نہ کیا کہ ادراک وفہم ومشقت کی قابلیت بعض حیوانات میں انسان سے بھی زیادہ ہے، اور تحقیق جدید سے ثابت کیا کہ کل قوائے روحانیہ جسم ودماغ سے متعلق ہیں۔ اور ہر ایک قوت دماغ کی ایک قسم کی ساخت سے متعلق ہے خواہ انسان میں ہو یا حیوان میں۔

ہمیں اس میں کلام کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان قوی کا تعلق روح سے ہے یا جسم سے مگر یہ ضرور کہیں گے کہ انسان اور حیوانات گوشکل اور بعض شمائل اور اخلاق وعادات میں برابر ہوں، مگر انسان کی شرافت اور فضیلت کو کوئی حیوان نہیں پہونچ سکتا۔ خصوصاً فضیلت تمدن کو اس نے تو تمام حیوانوں کو ذلیل و مسخر بنا دیا ممکن نہیں کہ تمام حیوان مل کر اب انسان کا مقابلہ کر سکیں اگر تمدن کے فوائد پر گہری نظر ڈالی جائے تو اس میں ذرا بھی شک نہ ہوگا کہ سعادت دنیوی تمدن سے بڑھ کر کسی چیز میں نہیں پھر جب یہ فضیلت اور کرامت خاص انسان کو حاصل ہے اور کل حیوانات اس سے محروم ہیں تو ماننا پڑے گا کہ نوع انسانی میں کوئی ایسی چیز ضرور ہے جو حیوانات کو نہیں دی گئی اور ایسی نعمت عظمٰے سے محروم رکھے گئے۔

ماہرین فرنیالوجی نے اقرار کیا ہے۔ جیسا کہ کوئب صاحب نے لکھا ہے کہ بعض اعضا جو انسان کے دماغ میں ہیں حیوانوں کے دماغ میں پائے نہیں جاتے مثلاً اعضائے قیاسات جیسے اعزاز غیری امید بحیلہ وغیرہ وغیرہ کہ خاص انسان سے تعلق رکھتے ہیں حیوانوں میں دیکھنے میں نہیں آتے۔

اس سے ظاہر ہے کہ گو انسان اور حیوان میں بعض امور شریک ہیں مگر بعض امور ایسے بھی ہیں کہ کسی حیوان میں نہیں پائے جاتے اس سے ثابت ہے کہ نوع انسانی قوت ممیّزہ وغیرہ کی وجہ سے تمامی انواع موجودات میں اعلیٰ درجہ تک پہونچ گئی ہے اگر سماعت اور بصارت اور دوسرے اوصاف میں حیوانات اس کے شریک ہوں تو اس کی فضیلت پر ان چیزوں کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا جیسے نباتات میں بھی قوت غاذیہ اور نامیہ اور حیات ہوتی ہے اور وہ نر و مادہ بھی ہوتی ہیں جن میں اعضائے تناسل بھی موجود ہیں جیسا کہ فن نباتات میں مصرح ہے مگر اس اشتراک سے انسان کی فضیلت میں کوئی نقصان نہیں آتا۔

الحاصل دلائل عقلیہ اور ہزار ہا سال کے تجربوں سے ثابت ہے کہ سوائے انسان کے نعمت تمدن حاصل کرنے کی صلاحیت ہی کسی میں نہیں اور کیونکر ہو اسکا منشا تو وہ بیشمار حاجتیں ہیں جو اس پر مجبور کر رہی ہیں جنکا

وجود سوائے انسان کے کسی میں نہیں پایا جاتا۔ خدائے تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہمیں محتاج بنا کر ایک اعلیٰ درجہ کی نعمت کا افتخار بخشا جس میں کوئی ہمارا ہمسر نہیں ہوسکتا۔ دیکھئے یہ احتیاج کیسی قابل قدر چیز ہے کہ فخر الانبیاء علیہ السلام فرماتے ہیں الفقر فخری۔ یہی احتیاج ہے کہ دین و دنیا کی نعمتیں اسی کی بدولت حاصل ہوتی ہیں دیکھ لیجئے کیسی ہی عمدہ سے عمدہ نعمت ہو اگر اس کی احتیاج نہ ہو تو ہیچ ہے کسی بزرگ نے کیا خوب کہا ہے۔

آب کم جو تشنگی آور بدست

اگر حق تعالیٰ ہماری فطرت میں ہر چیز کی احتیاج داخل نہ فرماتا تو تمام عالم ہمارے حق میں بیکار تھا اور مثل وحشیوں کے ہم بھی دولت تمدن سے محروم رہ جاتے مگر افسوس ہے کہ ہم اپنی احتیاجوں کا بھی احساس نہیں کر سکتے اسی کو دیکھ لیجئے کہ ہماری دینی اور دنیوی حالت کسی قدر قابل اصلاح ہے مگر ہم کچھ ایسے خواب غفلت میں ہیں کہ یہ بھی نہیں جانتے کہ ہم اس کی اصلاح کے محتاج ہیں یا نہیں۔ اگر ہمیں اپنی حاجتوں کا احساس بالتفصیل ہو اور اس کے ساتھ حاجت روائیوں کے کارخانہ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ محتاج بنانے والے حکیم علی الاطلاق نے کس قدر سامان حاجت روائیوں کا مہیّا فرمادیا ہے مثلاً ادھر تشنگی دی تو اُدھر پانی کے دریا بہادئے

جن کو کوئی روک نہیں سکتا اور اِدھر بھوک دی تو اُدھر رزق کا ایک کارخانہ کھول دیا جس کی کارگزاریوں میں آفتاب ماہتاب جیسے آیات بینات سرگرم ہیں۔ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

ابروبادومہ دخورشید و فلک درکاراند　　تاتونانے بکف آری وبغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمان بردار　　شرط انصاف نباشد کہ توفرماں نہ بری

اسی موقع میں حق تعالیٰ فرماتا ہے یَا اَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَی اللّٰہِ یعنے اے لوگو تم اللہ ہی کی طرف محتاج ہو۔ ہرچند ظاہر ہماری احتیاج پانی غلہ وغیرہ کی طرف ہے مگر ان میں کوئی چیز ایسی نہیں جو خود پیدا ہو جائے بلکہ ہر چیز ممکن ہونے کی وجہ سے اپنے وجود میں خالق کی طرف ضرور محتاج ہے جس سے ظاہر ہے کہ ہر حاجت ہماری خالق عز وجل ہی سے متعلق ہے۔ اگر ہم اپنی حاجتوں پر نظر ڈالیں اور غور کریں کہ ہر ایک حاجت ہماری کتنی چیزوں سے متعلق ہے تو یہ ثابت ہو جائیگا کہ عالم میں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے کوئی نہ کوئی حاجت ہماری متعلق نہ ہو گو اس کو ہر شخص معلوم نہ کر سکے مثلاً بادی الرائے میں خیال کیا جاتا ہے کہ ہماری نشو ونما زمین پر ہے اسلئے کل حاجتیں ہماری زمین ہی سے متعلق ہونگی آسمان سے کوئی ہمارا تعلق نہ ہونا چاہئیے۔ مگر حکماء نے اپنے تجربوں سے ثابت کر دیا

ہے کہ انظار کواکب کو بھی عالم سفلی کی اصلاح میں مداخلت تامہ ہے اور حق تعالیٰ خود فرماتا ہے وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ یعنے آفتاب و ماہتاب کو تمہارے مسخر بنادیا اور ارشاد ہے وَخَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا یعنے تمہارے لئے ہم نے تمام چیزیں زمین کی پیدا کیں غرضکہ عالم علوی اور سفلی پر تفصیلی نظر ڈالنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر آن میں ہم ہزارہا چیزوں کے محتاج ہیں پھر اگر بمقتضائے انسانیت ہر حاجت روائی کے وقت یہ سمجھا کریں کہ تمام حاجتیں ہماری خاص خدائے تعالیٰ سے متعلق ہیں جن کو وہ وقتاً فوقتاً روا فرماتا ہے اسلئے کہ بغیر اس کے کسی چیز کا وجود ممکن نہیں تو ہر وقت آیۂ شریفہ اَنْتُمُ الْفُقَرَاء کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچا رہے گا جس سے دل خود بخود اپنے منعم اور محسن عز شانہ کا منقاد اور شکر گذار رہیگا اور کیا تعجب کہ اس شکر گزاری کے عوض میں اور بہت سی دنیوی و اخروی نعمتیں عطا ہوں کیونکہ جب اس نے بغیر ہماری درخواست کے بے انتہا حاجتیں ہم میں پیدا کر کے دولت تمدن سے سرفراز فرمایا جسکی وجہ سے ہمارے بنی نوع وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ کے خطاب سے تمام عالم میں ممتاز ہوئے تو ان حاجتوں کا احساس کر کے اگر حاجت روائیوں کا شکر ادا کریں تو بیشک نعمتوں کی زیادتی کے مستحق ہونگے جیسا

کہ خود وعدہ فرماتا ہے وَلَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ۔

حق تعالیٰ نے تمام انواع میں سے صرف نوع انسانی کی فطرت میں جو بیشمار حاجتیں رکھیں اس سے صاف ظاہر ہے کہ قبل تخلیق عالم حق تعالیٰ کو منظور تھا کہ اس نوع کو عالم میں امتیاز تمدن عطا فرمادے اور اس سے یہ استدلال بھی ہوتا ہے کہ حق تعالےٰ کو ازلی محبت ہے جسکا حال اس مثال سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اگر کسی مقتدر سخی بادشاہ کے یہاں کوئی اس کا دوست مہمان ہو تو اس مہمان کی جتنی حاجتیں زیادہ ہونگی بادشاہ کی خوشنودی کا باعث ہے تا کہ ایک ایک حاجت اس کی روا کرے اور اپنی محبت اور عزت افزائی کا ثبوت دے اور اگر اس کی حاجتیں کم ہوں تو حتی الامکان حاجتیں پیدا کرنے کی طرف اس کی توجہ مبذول ہوگی مثلاً اس کو بھوک کم ہو تو اشتہا پیدا کرنے والی اشیا کو استعمال کرانے کا حکم طبیبوں پر صادر ہوگا۔ غرضکہ مہمان کی زیادہ حاجتیں زیادتی خوشنودی کا باعث ہے اور اگر خود حاجتیں اس کی کم ہوں اور ان کے پیدا کرنے پر وہ قادر نہ ہو تو اس کی کم قسمتی پر بادشاہ کو افسوس ہوگا۔ مگر چونکہ خدائے تعالیٰ خود خالق ہے اسلئے اس مکرم نوع انسانی کی فطرت ہی میں بے انتہا حاجتوں کو پیدا کردیا اور اس کی کل مایحتاج اشیا کو عالم میں بکثرت پیدا کرکے خبر دی کہ وہ سب کچھ تمہارے

لئے ہی ہم نے پیدا کیا ہے کما قال تعالیٰ وَ خَلَقَ لَکُم مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۔اوراس بات کو سمجھنے کے لئے عقل بھی دی جو کسی حیوان کو نصیب نہیں ۔ پھراس مکرم نوع کو تمام انواع میں امتیاز اور افتخار حاصل ہونے کی یہ تدبیر کی کہ انہی کی فطرتی حاجتوں سے ان کو مجبور کر کے ان کی عقل کو یہ راستہ بتایا کہ سب باہم اتفاق کر کے تمدن قایٔم کرلیں اوراس کے بعد وقتاً فوقتاً الہاموں کے ذریعہ سے ترقی تمدن کی تدبیریں بتائیں۔

الحاصل تمدن کی بنیاد فطرتی طور پر ڈالی گئی جس سے اس مکرم نوع انسانی کو سعادت دنیوی کے حاصل کرنے کا عمدہ موقع ہاتھ آگیا اب اگر باوجود اتنے فضل وکرم کے کوئی شخص کفران نعمت کرے اور ایسے افعال کا مرتکب ہو جو خلاف مرضی خالق اور تمدن کو ضرر پہونچانے والے ہوں تو اس پر اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ ۔ پورے طور پر صادق آجائیگا ہر چند تمدن کی بنیاد فطرتی طور پر قایٔم ہوئی ہے جس میں انسان کے فعل واختیار کو چنداں دخل نہیں مگر عقل بھی اُسکو مفید اور ضروری سمجھتی ہے اور یہ گواہی دیتی ہے کہ آدمی کے حق میں تمدن سے بہتر کوئی نعمت نہیں ہوسکتی اس لئے کہ کل دنیوی سعادتوں کا مدار اسی پر ہے کیسے ہی بیوقوف شخص سے کہا جائے کہ آبادی کو چھوڑ کر جنگل میں اقامت کرے ہر گز اس کی عقل اُسکو گوارا نہ

کرے گی۔ جب کل افراد انسانی تمدن کو نعمت عظمیٰ سمجھتے ہیں تو چاہیئے تھا کہ ہمیشہ اُس کی حالت درست رہتی اور ہر شہر و قریہ میں امن و امان قائم رہتا جو روح تمدن ہیں اور جس طرح اُسکی بنیاد ہمدردی پر رکھی گئی تھی اُس میں تغیر نہ آتا حالانکہ مشاہدہ اُسکے خلاف پر گواہی دے رہا ہے کہ بجائے ہمدردی ،دل آزاری ہے اور بجائے امن قائم کرنے کے وہ تدابیر سوچی جاتی ہیں جن سے بدامنی اور بے اطمینانی پھیلے۔ جدھر دیکھئے ایک دوسرے کا شاکی ہے۔ محکمہ جات سرکاری میں فوجداری وغیرہ مقدمات اس کثرت سے رجوع ہوتے ہیں کہ اہل عملہ کو فرصت نہیں ملتی جس سے ظاہر ہے کے بجائے ہمدردی کے جو منشاء تمدن کا تھا باہمی خصومت قایم ہوگئی جو باعث فساد تمدن ہے۔

اب یہاں یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہر آدمی کی عقل جب تمدن کو ضروری سمجھتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ برخلاف مقتضائے عقل لوگ اپنے ہاتھوں سے تمدن کو خراب کیا کرتے ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ تمدن کو خراب کرنے والی بھی وہی فطرتی حاجتیں ہیں جو باعث تمدن ہوئی تھیں کیونکہ جب آدمی کو کسی چیز کی حاجت ہوتی ہے تو وہ بہ مجبوری اس کے حاصل کرنے میں عقل سے مدد لیکر رفع موانع اور تحصیل ذرائع کی طرف مشغول

ہوتا ہے، اور جب تک کامیاب نہ ہو تسکین نہیں ہوتی غرضکہ وہی حالت جب اس کو خودغرضی پر آمادہ کرتی ہے جسکا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اس وقت نہ تمدن کے خراب ہونے کا خیال آتا ہے نہ اپنے یا دوسرے کے ضرر کا۔ جب ہر شخص اپنی اپنی حاجتوں میں خودغرضی اختیار کرے تو ظاہر ہے کہ تمدنی حالت کبھی اصلاح پذیر نہیں ہوسکتی۔

اصل منشا خرابی تمدن کا ایک اور ہے جس کے بیان کے لئے تھوڑی سی تفصیل درکار ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے نفس ناطقہ میں خالق عزوجل نے تین قوتیں رکھیں ہیں جن پر بقائے شخصی اور بقائے نوعی کا مدار ہے۔ ایک قوت ملکیہ جس سے حقایق امور کا ادراک متعلق ہے اور علم و حکمت کی تکمیل اسی سے ہوتی ہے یہ قوت دماغ میں رکھی گئی ہے۔ دوسری قوت شہویہ جسکو بہمیہ بھی کہتے ہیں اس سے تمام نفسانی خواہشیں مثل کھانے پینے اور جماع وغیرہ کے متعلق ہیں اگر کھانے پینے کی خواہش آدمی کو نہ ہو تو بدل ما یتحلل نہ پہونچنے کی وجہ سے چند روز میں ہلاک ہو جائیگا اور جماع کی خواہش نہ ہو تو نسل منقطع ہو جائیگی اس قوت کا مقام جگر ہے۔ تیسری قوت غضبیہ جسکو سبعیہ بھی کہتے ہیں اس قوت سے آدمی خطرناک امور پر پیش قدمی کرتا ہے۔ اسکا محل دل ہے۔ یہ تینوں قوتیں ایک دوسرے کے مبائن

ہیں ان میں سے جو قوت زیادہ اور غالب ہوگی دوسری قوتیں ضعیف اور بعض وقت کاَنَ لم یکن ہوجائیگی مثلاً قوت غضبیہ کو جب جوش ہوا تو اُسوقت نہ عقل ٹھکانے رہتی ہے نہ کوئی خواہش نفسانی ہوتی ہے اسی طرح قوت شہویہ اور ملکیہ کی زیادتی اور غلبہ کی وقت دوسری قوتیں ضعیف ہوجاتی ہیں۔ پھر ان قوتوں کی کمی وزیادتی ایک ایسی چیز سے متعلق کی گئی ہے جو ہمارے اختیار سے خارج ہے اسلئے کہ باوجودیکہ وہ نفس ناطقہ کی قوتیں ہیں مگر اعضا میں رکھی گئی ہیں اور ان کی کمی وزیادتی ان اعضا کی حرارت و برودت سے متعلق کی گئی ہے۔ مثلاً جسکے دل میں حرارت زیادہ ہو تو اس کا غصہ زیادہ اور شدت سے ہوگا اور جسکے دماغ میں حرارت زیادہ ہو تو اس کی فکر میں سرعت اور تیزی ہوگی جو عقل سے متعلق ہے اور جسکے جگر میں زیادہ ہو تو قوائے شہویہ میں زیادتی ہوگی اسی طرح حرارت کی کمی سے ان قوتوں میں کمی ہوگی۔ پھر ان اعضاء میں جو سردی وگرمی رکھی جاتی ہے اس کا ایک اندازہ مقرر نہیں کسی میں کم ہے تو کسی میں زیادہ مثلاً کسی کے دل میں حرارت اس قدر ہوتی ہے کہ ادنیٰ زیادتی سے اختلاج پیدا ہوجاتا ہے اور کسی کے دل میں اتنی کم ہوتی ہے کہ اس کے بڑھانے کیلئے دوائیوں کی ضرورت ہوتی ہے یہی حال جگر و دماغ کا ہے۔ غرضکہ قوائے بہیمیہ اور

سبعیہ اور ملکیہ کی کمی وزیادتی اعضاء رئیسہ کی حرارت و برودت سے متعلق کی گئی ہے اور وہ ہمارے احتیاج سے خارج ہے اور ظاہر ہے کہ جو افعال انسان سے صادر ہوتے ہیں ان کا مدار انہی قوتوں پر ہے اس لئے ممکن نہیں کہ سب کے افعال ایک طور پر صادر ہوں بلکہ جس پر قوت بہیمیہ کا غلبہ ہوگا اس سے وہ افعال زیادہ صادر ہونگے جو بہائم سے ہوا کرتے ہیں اور جس پر قوت سبعیہ کا غلبہ ہوگا اس سے وہ افعال زیادہ صادر ہونگے جو درندوں سے ہوا کرتے ہیں اور ایسے ہی لوگ زیادہ ہوا کرتے ہیں۔ اسلئے کہ عقل جو مدرک حقایق اور مکمل علم وحکمت ہے اکثر محسوسات اور وجدانیات کے مقابلہ میں پسپا ہوا کرتی ہے لذائذ جسمانی کا احساس وقتاً فوقتاً آدمی کو اپنی طرف ایسا مائل کرلیتا ہے کہ ادراکات روحانی کی نوبت ہی نہیں آتی اور ابھی معلوم ہوا کہ ایک قوت کے غلبہ سے دوسری قوت مغلوب ہوجاتی ہے اسلئے قوائے بہیمیہ اور سبعیہ کے متواتر غلبوں سے قوت ملکیہ اکثر مغلوب اور بیکار رہے گی۔ یہ آثار طبعی حرارت اور برودت کے ہیں پھر اس حرارت کو بڑھانے اور گھٹانے والے اسباب خارجیہ بھی بکثرت ہیں جیسے دن رات فصول اربعہ مختلف غذائیں دوائیں حرکات وسکنات وغیرہ جن سے باطن انسان میں حرارت یا برودت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ غرضکہ ان اسباب

داخلیہ وخارجیہ سے آدمی کی قوائے نفسانیہ پر ایسا برا اثر پڑتا ہے کہ قوائے بہیمیہ اور سبعیہ کو ترقی ہوتی ہے جس سے جانوروں کے سے افعال اکثر صادر ہوا کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ حیوانات میں انہی افعال کی وجہ سے تمدن کی صلاحیت نہیں اس لئے تمدنی حالت ہمیشہ مخدوش رہتی ہے ۔ اور نفس ناطقہ کو قوائے بہیمیہ اور سبعیہ کے غلبہ سے اتنی مہلت نہیں ملتی کہ قوت ملکیہ سے کام لیکر اصلاح تمدن وقتاً فوقتاً کر سکے۔

فن فرنیالوجی جس میں کاسہ سر سے متعلق مباحث ہیں اور یہ بیان کیا جاتا ہے کہ سر کے فلاں مقام سے فلاں صفت اور فلاں خلق متعلق ہے۔ اس میں مقاومت کا مقام بتلا کر لکھا ہے کہ اگر یہ مقام کشادہ ہو اور اس کے ساتھ مقام تخریب بھی کشادہ ہو تو ایسے شخص سے جھگڑے کج بحثیاں طرح طرح کے فساد ایذادہی خون ریزی وغیرہ فسادات ظہور میں آئیں گے اور مقام امساک یا خواہش فراہمی بتلا کر لکھا ہے کہ اس کی کشادگی ہو تو آدمی چوری کرتا ہے۔ اور مقام اعزاز ذاتی یا حفظ مراتب بتلا کر لکھا ہے کہ وہ باعث گستاخی، خودستائی، خودغرضی، آزادی ہے اسی طرح بہت سے اخلاق کے مقامات معین کئے ہیں ۔ غرضکہ تحقیق جدید سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق قبیحہ بعضوں کی جبلت ہی میں داخل ہوتے ہیں جن سے تمدن کو ضرر

پہونچتا رہتا ہے۔ بہر حال تمدن کو بگاڑنے والے افعال کا صادر ہونا افراد انسانیہ سے فطرتی طور پر لازم ہے۔ خواہ ان کا منشا مقامات دماغ ہوں یا حرارت وبرودت اعضائے رئیسہ اور یہ تو خود مشاہدہ سے ثابت ہے کہ بعضوں کی طبیعت میں قوائے غضبیہ کے آثار مثل تکبُّر، بد خلقی، قساوت قلبی، حسد، کینہ وغیرہ پائے جاتے ہیں اور بعضوں کی طبیعت میں آثار قوت شہو یہ مثل فسق وفجور وحرص وبخل وغیرہ۔

اب غور کیا جائے کہ انسان میں صفات بہیمیہ اور سبعیہ جب پورے طور پر پائے جاتے ہیں اور غلبہ حاصل کرنے کے آلات جو حیوانوں کو دئے گئے ہیں، فطرۃً اس کے پاس بھی موجود ہیں اور علاوہ ان کے اس کو عقل ایسی دی گئی ہے کہ تلوار و بندوق اور توپ جیسے آلات کے ایجاد پر قادر ہے تو کیا ممکن ہے کہ تمدنی حالت درست رہ سکے ہر گز نہیں۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لئے عقل نے مشورہ دیا کہ ایک قوت ایسی قائم کی جائے کہ وحشی طبعوں کو مقہور کرکے حالت تمدن کی اصلاح وقتاً فوقتاً کیا کرے۔ چنانچہ سب نے ایک شخص کو بادشاہ مقرر کیا اور اس بات پر راضی ہوگئے کہ اپنی جان و مال میں واجبی طور پر جو کچھ تصرف کرے سب قبول مگر اُن عام وحشی طبعوں اور گرگ سیرتوں سے نجات ملے اور اس کو رائے اور

اجرائے احکامات میں مدد دینے کیلئے ایک جماعت منتخب کی گئی اور سلطنت کی بنیاد قائم ہوئی۔ چنانچہ سلطنت نے وہ کام اپنے ذمہ لیا اور حتی الامکان ایسے قواعد ایجاد کئے کہ ظلم وزیادتی کی بیخ کنی ہو اور تمدن کو خراب کرنے والوں کی سرکوبی کرکے اصلاح تمدن کی فکر کی تاکہ ہر شخص فارغ البال ہو کر امن وآسایش کے ساتھ زندگی بسر کرے اور رعایا اور سلطنت میں ہمدردی کی نسبت قائم رہے۔

مگر سلاطین اور اعوان سلطنت بھی آخر اسی نوع انسانی کے افراد تھے یہ تو ممکن نہیں کہ ان سب کی قوت ملکیہ ان کی قوت بہیمیہ اور سبعیہ پر غالب ہو اور لذائذ جسمانیہ اور قوت غضبیہ سے مبریٰ ہوسکیں اسلئے ایسے بعضے سلاطین اور اعوان سلطنت کا پیدا ہونا بھی لازم تھا کہ بجائے اصلاح، حالت تمدن زیادہ ابتر ہو اسلئے کہ طبیعت انسانی عیش پسند واقع ہوئی ہے اور اس کا مقتضےٰ ہے کہ لذائذ جسمانی جو سعادت دنیوی ہیں، جس طرح ممکن ہو حاصل کرے پھر سب حکام کو حکومت حاصل ہو اور ان کو نفسانی خواہشوں سے روکنے والی کوئی چیز نہ ہو اور رعایا ان کے مقابلہ میں مجبور، بے دست و پا ہوں تو ظاہر ہے کہ اُن کے قوائے شہویہ اور غضبیہ کیسے آزادانہ اور بے باکانہ تصرف کرتے ہوں گے ایسی حکومت میں رعایا کے

حسب حال یہ شعر ہوگا۔

گراز چنگال گرگم در ربودے چو دیدم عاقبت خود گرگ بودے

بلکہ ایسی حکومت تمدن کے حق میں زیادہ تر مضر ہے۔ کیونکہ ظالم صرف اپنی ذاتی قوت سے تمدن کو ضرر پہونچاتا تھا اور یہاں اس کے ساتھ قوت حکومت مددگار ہے اگر کتب تواریخ دیکھی جائیں تو صفحے کے صفحے ایسے حکام کے حالات سے سیاہ نظر آئیں گے۔ جب حکام جن کی ضرورت صرف اصلاح تمدن کے لئے عقل سے ثابت ہے خود خرابی تمدن کے باعث ہوں تو بتائیے کہ اس کے بعد اصلاح تمدن کی کیا امید ہوسکتی تھی۔ غرضکہ جس طرح تمدن کو قایم کرنے والے اسباب خالق عزوجل نے پیدا کئے اس کے بگاڑنے والے اسباب بھی ان کے پہلو بہ پہلو پیدا کئے۔

اب یہاں عقل حیران ہے کہ فطرت تمدن کو قایم بھی کررہی ہے اور بگاڑ بھی رہی ہے حالانکہ مقتضائے فطرت وطبیعت ایک قسم کا ہوتا ہے مگر عقل کی حیرانی یوں دفع کی جاتی ہے کہ فطرت بھی ایک مخلوق چیز ہے حکیم علی الاطلاق جو چاہتا ہے اس سے کام لیتا ہے دراصل خدائے تعالیٰ کو منظور تھا کہ اس مکرم نوع انسانی کو ابدالآباد کی سعادت سے ممتاز اور سرفراز فرمادے اسلئے جس طرح کثرت احتیاج سے سعادت دنیوی کی بنیاد ڈالی

تھی اسی طرح ان حاجتوں کو پیدا کرنے والے قوائے شہویہ اور غضبیہ سے ابدی سعادت کی تمہید کی۔ اور اس کی تخلیق اس طور پر ہوئی کہ جتنے قویٰ اور صفات جانوروں کے ہیں سب اس کو دی گئیں جس سے اشتباہ ہو گیا کہ وہ بھی ایک جانور ہے اور بعضوں نے تو صاف کہہ دیا کہ ہم بندروں کی نسل سے ہیں۔ مگر اس کو تمام عالم میں ممتاز کرنے کے لئے ایک عقل ایسی دی کہ کوئی جانور اب اس کی ہمسری نہیں کرسکتا اور اس کی فطرت میں تحصیل علم اور تحقیق کا مادہ رکھا گیا چنانچہ جو لڑکا عقل ہیولانی سے قدم باہر رکھتا ہے تو ہر نئی چیز کو دیکھ کر پوچھتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے جس سے مقصود تحقیق ماہیت ہے کیونکہ منطق میں مصرح ہے کہ ماھو جس کا ترجمہ وہی لڑکوں کا سوال ہے دریافت ماہیت کیلئے موضوع ہے۔ اسلئے ظاہر ہے کہ ابتدائے زمانہ شعور سے ماہیات اشیا کی تحقیق شروع ہوتی ہے۔ اس کے سوا جہاں دو شخص باتیں کرتے ہوئے نظر آئیں گے ان میں ضرور ایک دوسرے سے دیکھے یا سُنے ہوئے واقعات بیان کرتا ہوگا اور سننے والا نہایت توجہ سے وہ سنتا ہوگا جس سے مقصود صرف تحصیل علم ہے اسی وجہ سے اگر کوئی دیکھی یا سنی ہوئی بات ہو تو سننے والا کہہ دیتا ہے، کہ میں بھی سن چکا ہوں۔ اور اگر کوئی نادر بات بیان کی جائے، تو نہایت دلچسپی اور تحیر سے سنی جاتی ہے جس

سے بیان کرنے والے کو قدردانی کا لطف آجاتا ہے اسی وجہ سے اکثر نادر نادر واقعات یاد رکھ کر مجلسوں اور احباب میں بیان کیا کرتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ تقریباً کل گفتگو جو لوگ باہم کیا کرتے ہیں اسی غرض سے سنی جاتی ہے کہ جو بات معلوم نہیں وہ معلوم ہو۔غرضکہ آدمی کی فطرت علم دوست اور تحقیق پسند واقع ہوئی ہے۔

یہ بات ماننے کے قابل ہے کہ جب ادنیٰ ادنیٰ واقعات اور ماہیات اشیاء کے حاصل کرنے میں اس قدر دلچسپی ہوتی ہے تو مقتضائے عقل یہ ضرور ہونا چاہیئے کہ آدمی پہلے اپنی اور عالم کی حقیقت معلوم کرے کہ وہ ممکن ہے یا واجب۔اور جب اجزائے عالم کو دیکھ کر یہ معلوم ہو جائے کہ خود بخود کوئی چیز پیدا نہیں ہوسکتی جب تک کوئی پیدا نہ کرے تو عقلاً اس سے خالق عالم کا ثبوت ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ تقریباً کل انسان خالق کے قائل ہوں۔اس کے بعد فطرتی تحقیق پسندی کا مقتضٰی ہے کہ اپنے خالق کے حالات اور کیفیت تخلیق عالم وغیرہ امور معلوم کرے اس لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت ثابت ہوتی ہے جو حق تعالیٰ کے اور ہمارے بیچ میں واسطہ ہو اور تشنگان علوم آلیہہ کو ان کے خالق کے حالات اور پیام پہونچایا کرے۔یہاں اس بات کی طرف توجہ کرنے کی ہمیں ضرورت نہیں کہ وہ

شخص پیغامبر کیسا ہونا چاہیئے اور اس کے پہچاننے کے کیا طریقے ہیں کیونکہ وہ ایک مستقل وسیع بحث ہے یہاں اسی قدر معلوم کرنا کافی ہے کہ عقل کی رو سے نبی کی ضرورت ثابت ہے۔

رہی یہ بات کہ بہت سارے عقلاء اس مسئلہ کی طرف توجہ نہیں کرتے سو اس کے اسباب دوسرے ہیں منجملہ ان کے ایک یہ ہے جو ابھی معلوم ہوا کہ قوت شہویہ اور غضبیہ کے جھگڑوں میں نفس ناطقہ ایسا مشغول ہو جاتا ہے کہ قوت ملکیہ سے کام لینے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ مگر یہ عذر اس کا قابل قبول نہیں ہوسکتا اسلئے کہ جب اس کی فطرت میں تحقیق حقایق اور ہر قسم کے ادراکات کی طرف توجہ تام رکھی ہے تو اس کو ضرور ہے کہ انبیا علیہم السلام نے جو خبریں سنائی ہیں ان میں غور و فکر کر کے خالق کی تصدیق کرے جس طرح تقریباً کل بنی نوع انسان اس کی تصدیق کرتے ہیں گو ان میں مشرک بھی ہیں مگر وہ بھی ایک خالق کو ضرور مانتے ہیں اسلئے کہ جب تین کو مثلاً کسی نے مان لیا تو ایک کو بطریق اولیٰ مانا۔ یہ بحث دوسری ہے کہ اس قسم کے توحید مفید ہوگی یا نہیں۔ ہمارا مقصود یہاں اسی قدر ہے کہ عقل تحقیق پسند خالق کے وجود کو ضرور مانتی ہے۔ اگر چہ عقلا صرف دنیوی کام میں لگ کر اس طرف توجہ نکریں اور خالق کو نہ مانیں تو وہ تقریباً

تمام انسانوں کے مقابلہ میں کسی شمار میں نہیں آسکتے۔

بعض حکمانے جوصرف دنیوی سعادت حاصل کرنے کی غرض سے حقایق اشیاء میں خوض وفکر کی اوران سے منافع دنیوی بھی حاصل کئے اور خدا کی طرف بالکل توجہ نہ کی ان پر یہ الزام ضرور عاید ہوتا ہے کہ اس قدر سعادت دنیوی کے پیچھے کیوں پڑ گئے کہ سعادت دینے والے سے بالکل اعراض اور انحراف ہوگیا۔ اتنا تو جانا ہوتا کہ جس عقل کے ذریعہ سے یہ سعادتیں حاصل ہوئی ہیں نہ اس کو اپنی ذات سے پیدا کیا نہ کسی سے مستعار لیا آخر وہ بھی عدم سے وجود میں آئے اور کسی چیز کا وجود میں آنا ممکن نہیں جب تک خالق اس کو وجود نہ دے ادنیٰ جھونپڑا خودبخود نہیں بن سکتا پھر اتنا بڑا عالم اور عقل جیسی بے نظیر چیز بغیر خالق کے بنائے کیونکر بن گئی۔ اور ایسی بے بدل نعمتیں دینے کا عقلاً کوئی حق ہے یا نہیں۔ اور اس نے انبیا علیہ السلام کے ذریعہ سے جو اپنے حقوق معلوم کرائے اس میں غور کیا ہوتا کہ آخر ہم آدمی ہیں جانور نہیں جو مرفوع القلم ہوں۔ ہم جس بادشاہ کے ملک میں رہیں اس کی سیادت کا اعتراف کرنا اور حقوق شاہی کا ادا کرنا ہم پر ضرور ہے۔ جب بادشاہ کا اعتراف کرنا اور حقوق کی ادائی ضرور ہے تو خالق جس نے ہمیں پیدا کیا اور جس کی خدائی میں ہم بستیاں آباد کر کے

بے انتہا فوائد حاصل کرتے ہیں اس کا اعتراف اور اس کے حقوق کی ادائی کس قدر ضروری ہوگی۔ پھر کسی نبیؐ نے یہ فرمایش نہیں کی کہ دنیا چھوڑ کر ہمہ تن عبادت الٰہی میں مشغول ہو جاؤ بلکہ نبیؐ نے اس عالم میں آسایش سے بسر کرنے کے وہ طریقے بتلائے کہ سب مرفہ الحال اور دولت تمدن سے مالا مال ہو جائیں اور سعادت دنیوی پورے طور پر حاصل کرنے کے لئے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انتم اعلم بامور دنیا کم جس سے صاف اجازت دینی معلوم ہوتی ہے کہ اپنے علم سے کلیں ایجاد کرو۔ تجارت کرو۔ زراعت کرو۔ جو چاہو کرو مگر خالق کا اعتراف کر کے چند حقوق اس کے ادا کر دو۔ پھر یہ ادائے حقوق بھی بیکار نہ جائے گی بلکہ اس کے صلہ میں ہمیشہ کے لئے ایسی ایسی نعمتیں دی جائیں گی جن کا مثل کسی نے دیکھا نہ سُنا۔

ہر چند بات بہت آسان تھی اور جتنی مشقتیں دنیا طلبی میں کی جاتی ہیں اتنی بھی مشقت اس میں نہیں مگر یہاں ایک راز ہی دوسرا ہے ممکن نہیں کہ ہر کس و ناکس خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کر لے اسی کو دیکھ لیجئے کہ کیا ممکن ہے کہ کوئی نوع جانوروں کی اپنے میں حاجتوں کو پیدا کر کے نعمت تمدن حاصل کرے ہر گز نہیں اسی طرح ممکن نہیں کہ ہر شخص خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اپنے میں پیدا کر کے سعادت ابدی کا استحقاق حاصل کرے

کیونکہ جس طرح سعادت دنیوی کے لئے حق تعالےٰ نے صرف ایک نوع انسانی کو خاص فرمایا اسی طرح سعادت ابدی کے لئے اسی نوع کی ایک صنف کو مختص فرمایا اور باقی سب لوگ اس جرم میں مستحق شقاوت ابدی ہوئے، کہ باوجود عقل اور تمیز اور اقتضائے فطرت اور دعوت انبیاء کے نہ اپنے خالق کو مانا ،نہ اس کے حقوق ادا کئے ۔اب ان کو مجال چوں و چرانہیں، اور نہ یہ پوچھ سکتے ہیں کہ کیا وجہ ہمارے نبی ﷺ نوع جنت میں ہیں اور ہم دوزخ میں، کیونکہ خدائے تعالےٰ نے ان کو عقل دی اور دولت تمدن سے ممتاز کر کے ہر طرح کی سعادت دنیوی دی، پھر انبیاء علیہم السلام کو بھیجا تاکہ تمام حجت کریں باوجود اس کے انھوں نے کل نعمتوں کی نا شکری کی اور عقل کو دنیوی کاموں میں لگا دیا قوت ملکیہ کو بیکار کر دیا اور مثل بہایم کے قوت بہیمیہ اور سبعیہ ہی کے مسخر رہے۔اگر جانور یہ عذر پیش کریں کہ ہم نے کیا قصور کیا تھا جو دولت تمدن اور سعادت دنیوی سے محروم رکھے گئے تو کسی قدر ان کا عذر قابل توجہ ہوسکتا ہے بخلاف اس کے کفران نعمت کرنے والے کافروں کا عذر ہر گز قابل سماعت نہیں ہوسکتا اسلئے کہ ان کو عقل دے کر سوچنے اور تحقیق کرنے کا موقع عمر بھر دیا گیا اور انبیا علیہم السلام کو بھیج کر حجت تمام کر دی گئی اس پر بھی ان کو جنبش نہ ہوئی۔

سبحان اللہ کیسی حکمت بالغہ ہے کہ خالق عزو جل سے کوئی معترضانہ سوال ہی نہیں کرسکتا۔ جانوروں کو عقل ہی نہیں جس سے بھلی بُری میں تمیز کر کے اپنی بے نصیبی اور محرومی پر مطلع ہوں اور سوال کی نوبت آئے البتہ آدمیوں کو عقل ہے مگر جب انہوں نے عقل سے خداطلبی کا کام ہی نہ لیا اور بعضوں نے جولیا تو اسی کو رہزن بنالیا تو اب کس منہ سے پوچھ سکتے ہیں کہ ہم کیوں محروم کئے گئے۔ صدق اللہ تعالےٰ **لَا یُسْـَٔلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْـَٔلُوْنَ** و قولہ تعالیٰ **وَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ**۔

اب یہ دیکھنا چاہئے کہ سعادت ابدی حاصل کرنے والوں نے کیا کام کیا جس سے وہ اس دولت عظمیٰ کے مستحق ہوئے۔ ادنیٰ تامل سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ انہوں نے قوت بہیمیہ اور سبعیہ کو مغلوب کر کے قوت ملکیہ کو موقع دیا کہ اطمینان سے اپنا کام کرے کیونکہ بغیر اس تدبیر کے ممکن نہ تھا کہ وہ کچھ کام کر سکے جیسا کہ ابھی معلوم ہوا کہ ان قوتوں میں مبائنت ہے جو قوت مطلق العنان اور غالب کردی جائے دوسری قوتیں اس کے مقابلہ میں مغلوب بلکہ بیکار ہو جائے گی۔ غرضکہ ان کی عقل کو جب غور فکر کرنے کی فرصت ملی تو اس نے یہ بات بدلائل ثابت کردی کہ عالم کا ایک خالق ہے اس کی طرف سے پیغاموں کا پہونچنا اور اس کے حقوق

بندوں پر واجب الاداء ہونا ایک ضروری بات ہے پھر پیغامبروں کے حالات پر اس نے غور کیا تو یہ بات قابل تصدیق معلوم ہوئی کہ جب تک وہ حضرات من جانب اللہ مامور نہ ہوئے ہوں نہ ان سے معجزات صادر ہوسکتے تھے نہ ایسے افعال جو اقتدار نفوس بشریہ سے خارج ہیں۔ پھر ان حقوق پر غور کیا جو بندوں پر مقرر ہیں دیکھا کہ کچھ تو خیال سے متعلق ہیں اور کچھ جوارح سے جن سے افعال صادر ہوتے ہیں اور ان سب میں یہ بات مدنظر ہے کہ اگر وہ پورے پورے ادا کئے جائیں تو سردست فائدہ ہے کہ حالت تمدن کی اس درجہ اصلاح ہوجائے گی کہ دنیا میں کسی کو کسی سے شکایت کا موقع ہی نہ ملے گا اور پورے طور پر امن قائم ہوجائے گا۔ الحاصل جب انہوں نے تعصب اور عناد وغیرہ سے خالی الذہن ہوکر ان امور میں مکرر، مکرر غور کیا تو ان کو یقین ہوگیا کہ بے شک وہ کل احکام جو نبی ﷺ لائے ہیں سب خدائے تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے ہیں اور جو کچھ نبی ﷺ نے فرمایا اس کے صحیح ہونے میں ذرا بھی شک نہیں۔ جس کام کے کرنے یا نہ کرنے پر جنت یا دوزخ کا وعدہ یا وعید حدیث شریف میں وارد ہے۔ اس پر ایسا یقین کہ گویا دیکھ رہے ہیں۔ اول تو اس مشاہدہ کی وجہ سے کوئی ناشایستہ حرکت ہی کیوں صادر ہونے لگی اور اگر خواہش نفسانی کے

غلبہ سے کوئی صادر ہو بھی گئی تو بغیر مطالبہ کے درخواستیں پیش ہو رہی ہیں کہ جو کچھ سزا ہو اسی عالم میں ہو جائے۔

چنانچہ ماعز رضی اللہ عنہ کا واقعہ تمام اسلامی دنیا میں مشہور ہے کہ جب اتفاقاً ان سے زنا صادر ہو گیا تو فوراً حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور درخواست کی کہ رجم کا حکم صادر فرمایا جائے حضرت ﷺ نے کسی قدر تاخیر کی مگر سزائے اخروی کے مشاہدہ سے بار بار یہی عرض کرتے تھے کہ اب تاخیر نہ فرمائی جائے۔ چنانچہ جب رجم ہو چکا اس وقت ان کی جان کو تسکین ہوئی۔

جنگ قادسیہ میں جب رستم فوج کثیر اور بہت سے ہاتھیوں کو لیکر مسلمانوں کے مقابل ہوا اور لڑائی کا ہنگامہ گرم ہوا۔ اس وقت ابو محجن ثقفی جو شراب پینے کے جرم میں مقید تھے قید خانہ کے دریچہ سے لڑائی کا تماشہ دیکھ کر بے اختیار ہوئے جاتے تھے آخر ضبط نہ کر سکے اور سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی بیوی سلمٰی کے پاس گئے کہ خدا کے لئے اس وقت مجھے چھوڑ دو لڑائی سے جیتا بچا تو خود، آ کر بیڑیاں پہن لونگا۔ چنانچہ انہوں نے ان کی بیڑیاں کاٹ دیں انہوں نے فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر اس زور شور سے لشکر مخالف پر حملہ کیا کہ جس طرف نکل گئے صف کی صف اُلٹ دی

اسی طرح دن بھر تنہا حملہ کرتے رہے جس سے سعد رضی اللہ عنہ اور سب مسلمانوں کو تحیر تھا کہ یہ کون بہادر ہے جو اس طرح ہمدردی کر رہا ہے جب شام ہوئی تو خود قید خانہ میں جا کر بیڑیاں پہن لیں سلمٰی رضی اللہ عنہا نے سب حالات سعد رضی اللہ عنہ سے بیان کیے انہوں نے اُسی وقت اُن کو رہا کر دیا اور کہا کہ خدا کی قسم مسلمانوں پر جو شخص یوں نثار ہو میں اُسکو سزا نہیں دے سکتا ابو محجن نے کہا بخدا میں بھی آج سے پھر کسی شراب کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ دیکھئے یہ ایمان ہے، قید خانہ میں پڑے سزا بھگت رہے ہیں۔ مگر دل میں ایمان اس درجہ جوش زن ہے کہ اُنکا ذرا بھی ملال نہیں پھر اُس حیرت انگیز جان بازی کے بعد ایک لفظ تک زبان پر نہ آیا کہ آج ہم نے یہ کام کیا، بلکہ حسب وعدہ اپنے ہاتھوں سے بیڑیاں پہن لیں اور باوجود اُس شجاعت خداداد کے حکم شرعی میں ذرا بھی فرق نہ آنے دیا۔

اصل منشا اسکا یہ تھا کہ جب یہ آیہ شریف نازل ہوئی اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ یعنی خدائے تعالٰی نے مسلمانوں کی جان و مال جنت کے معاوضہ میں خرید لئے) تو اہل ایمان نے اپنی جان و مال پر سے اپنا تصرف اُٹھا کر خدائے تعالٰی کے تصرف میں دے دیا کہ جس طرح کا حکم ان میں جاری فرمائے سر مو

انحراف نہ ہوگا گویا جان و مال کو اپنے پاس صرف عاریت سمجھتے تھے۔

جنگ یرموک میں جب معرکہ کارزار گرم ہوا اور عیسائیوں کے حملوں سے مسلمانوں کے قدم اُکھڑ گئے اور شرجیل رضی اللہ عنہ کو کفار نے گھیر لیا اُس وقت آپ کی یہ حالت تھی کہ رومیوں کا چاروں طرف سے نرغہ تھا اور آپ پہاڑ کی طرح بیچ میں ڈٹے کھڑے یہ آیت پڑھ رہے تھے اِنَّ اللّٰہَ اشْتَریٰ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃ اور نعرہ مارتے تھے کہ خدا کے ساتھ سودا کرنے والے اور خدا کے ہمسایہ بننے والے کہاں ہیں یہ آواز جس کے کان میں پڑی بے اختیار لوٹ پڑا یہاں تک کہ اُکھڑی ہوئی فوج بھی سنبھل گئی اور شرجیل رضی اللہ عنہ نے اُن کو لے کر اس بہادری سے جنگ کی کہ رومی جو ٹوٹے چلے آتے تھے بڑھنے سے رُک گئے۔ غرضکہ خدا کی راہ میں جان کا دینا اُن پر اُتنا بھی گراں نہیں ہوتا جس قدر ہم پر راہ خدا میں پیسہ دینا گراں ہوتا ہے۔

الحاصل اُن کے ایمان نے اُن کے قوائے شہویہ اور غضبیہ پر اس قدر گہرا اثر ڈالا تھا کہ تقریباً کوئی فعل اُن سے صادر نہیں ہوتا جو خلاف مرضی الٰہی ہو۔ اسی ایمان کی بدولت ہر ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھتا تھا ایسے بھائی نہیں جو آجکل دیکھے جاتے ہیں بلکہ ایسے کہ اجنبی شہروں کے لوگ کہ

جن کو نہ کبھی دیکھا نہ اُنکا نام سُنا جب اپنے شہروں میں آگئے تو تقسیم کر کے برابر آدھا مال اُنکو دیدیا اور اگر دو بی بیاں کسی کے نکاح میں ہیں تو کہہ دیا کہ جس کو چاہو پسند کر کے نکاح کر لو اور اُس کو طلاق دینے پر مستعد ہو گئے اب بتایئے کیا اس سے بڑھ کر کوئی ہمدردی اور اخوت ہو سکتی ہے۔

ادنیٰ تامل سے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ جس قوم میں یہ اتحاد و ہمدردی ہو وہاں کہ تمدن کی کیا حالت ہو گی اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایمان اور تمدن میں کس قسم کا ربط ہے۔ یہ تو مسلمانوں کی تعلیم میں ایک عام بات تھی اس کے سوا ہر ایک جزئی اور خاص خاص معاملات تمدن میں جو جو تعلیمیں ہوئی ہیں اُنکی گنجایش اس مختصر میں کہاں اُن سے تو کئی علم مدون ہو گئے جنکی ہزارہا کتابیں موجود ہیں۔ منجملہ اُن کے چند امور بطور مشتے نمونہ از خروارے لکھے جاتے ہیں۔

وہ امور جن کے کرنے کی فضیلت اور تاکید ہے

ہر کام میں نیک نیتی۔صدق۔راست بازی۔اتحاد باہمی۔ خوش خلقی۔امانت داری ۔دیانت داری ۔ ایک دوسرے کی مدد۔ سفارش ۔حاجت روائی ۔ بیمار پرسی ۔ مسافر نوازی۔ ایفائے وعدہ ۔اصلاح بین الناس۔ادائی شہادت۔مشورت۔نیک مشورت دینی۔تواضع۔قناعت۔

عفو تقصیر۔عیب پوشی ۔ماں باپ اور اپنے حاکم کی فرمانبرداری کل حقوق کی ادائی۔ بزرگوں کی تعظیم۔چھوٹوں پر شفقت ۔صلہ رحمی ۔جو بات اپنے لئے پسند کی جاتی ہے دوسرے کیلئے پسند کرنی۔محتاجوں کی خبر گیری۔ سخاوت ۔رحم ۔لونڈی غلام کو اپنے بھائی بہن کے برابر سمجھنا اور آپ جو کھاتے اور پہنتے ہیں ان کو بھی وہی کھلانا اور پہنانا ۔فریاد رسی ۔ظالم کے پنجے سے مظلوم کو چھڑانا۔عدل وانصاف جس کام پر اُجرت لی گئی اس کو دیانت اور عمدگی سے ادا کرنا ۔مسافر خانے ۔پُل ۔کنویں اور راستوں کی تعمیر و ترمیم ۔اشاعت علم میں کوشش۔ حرفہ اور کسب سے اپنی اور اپنے عیال کی پرورش۔ ہر کام اُس کے اہل سے لینا وغیرہ وغیرہ۔

وہ امور جن سے بچنے اور احتراز کرنیکی تاکید ہے

جھوٹ۔وعدہ خلافی۔عہد شکنی۔ جھوٹی گواہی۔افترا پردازی ۔ بہتان۔ غیبت چغلی۔سخن چینی۔لوگوں کے عیوب کی تجسس۔استہزا تمسخر۔تحقیر توہین۔ہجو۔دل شکنی۔ سخت کلامی۔ سب وشتم۔فحش و بیہودہ گوئی۔فتنہ انگیزی۔مکر۔فریب۔چاپلوسی۔قمار بازی۔ناپ تول کی کمی۔ دغا بازی۔غصب ۔چوری۔مفسدہ پردازی۔ بغاوت۔غارتگری۔اذیت رسانی۔سوال۔ بھیک۔ مانگنی۔حرص۔طمع۔عداوت۔بغض۔حسد۔

کینہ۔تین روز سے زیادہ کسی سے رک کے رہنا۔تخویف۔جن امور سے نزاع اور جھگڑے پیدا ہوں اُنکا ارتکاب۔نشہ کی چیزوں کا استعمال۔ظلم۔رشوت۔لوگوں کی آمد و شد کے مواقع کونجس کرنا جس سے اُن کو تکلیف ہو۔احتکار یعنی غلہ کواس خیال سے روک رکھنا کہ اگر مہنگا ہوگا تو بیچیں گے وغیرہ۔

اس میں شک نہیں کہ حکماء بھی اصلاح تمدن کے جو اصول ایجاد کرتے رہتے ہیں اُن میں بھی اکثر اسی قسم کی باتیں ہیں مگر صرف اصول قرار دینے سے قوائے شہویہ وغضبیہ کی اصلاح ممکن نہیں اس لئے کہ جو قواعد عقل سے ایجاد کئے جاتے ہیں اُن کے توڑنے کی تدبیریں بھی عقل ہی سے ایجاد کر لیا کرتے ہیں۔مثلاً جھوٹ کہنا قانون میں بھی جرم ہے۔مگر جن کو ایمان سے کوئی تعلق نہ ہو اپنا مقصود حاصل کرنے کی غرض سے جس بات کو چاہیں خلاف واقع قانونی پیرایہ میں لا سکتے ہیں اور یہ بھی کہ اس خلاف واقعہ یعنے جھوٹ کا ثابت ہونا ہی مشکل ہوگا۔اسی پر تمام جرموں کا قیاس ممکن ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قانون حکماء کا مقتضیٰ نہیں ہوسکتا کہ اصلاح تمدن ہو بلکہ خودغرض حاکم سیرتوں کی عقلوں کو اس طرف متوجہ کر دے گا کہ واقعات کی حیثیت اور نوعیت بدل کر کسی قانونی دفعہ کے تحت میں داخل کر دیں اور

جس طرح ممکن ہو اپنی خواہشیں پوری کیا کریں جس سے راستی پسند جن کی طبیعت میں مکروفریب و دغا بازی نہ ہو ہمیشہ ایسے لوگوں کے قابو میں اس طرح پھنسے رہیں گے جیسے بکری بھیڑیئے کے چنگل میں ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے ایمان کا ذاتی مقتضےٰ یہ ہے کہ کوئی ایسی حرکت جس میں کسی کی حق تلفی یا ظلم و زیادتی ہو ہرگز وقوع میں نہ آسکے اس لئے کہ ہر ایماندار جس کو کامل یقین ہو کہ خدائے تعالیٰ دل کی باتوں کو بھی جانتا ہے اور ہر بات کی جزا وسزا دوسرے عالم میں ضرور ہونے والی ہے اور ایک روز ایسا آنے والا ہے کہ خدا کے روبرو ہم حاضر ہوں گے اور اُن تمام اعمال کا محاسبہ ہوگا جو ساری عمر میں کئے تھے۔ اور جرائم کا اثبات اس طور پر ہوگا کہ علاوہ دوسرے گواہوں کے خود ہمارے ہاتھ پاؤں وغیرہ اعضاء ہمارے گناہوں پر گواہی دیں گے جس کا انکار ہم سے ممکن نہ ہوگا۔ تو ایسا شخص کبھی یہ خیال نہیں کرسکتا کہ خواہش نفسانی کو کسی حکم شرعی کے تحت میں لاکر خدائے تعالیٰ کو دھوکہ دینا ممکن ہے اس لئے ہر خواہش نفسانی کے وقت ایماندار کو یہ خیال ضرور آئیگا کہ آیا خدائے تعالےٰ نے اس کام کی اجازت دی ہے یا نہیں اور جب اُس کو علم کے ذریعہ سے معلوم ہو جائیگا کہ اُس کی اجازت نہیں تو ضرور اُس سے احتراز کرے گا۔ اس طریقہ سے جتنے افعال

قوائے شہویہ اور غضبیہ سے متعلق ہیں سب کی اصلاح خود بخود ہو جائے گی کیونکہ آدمی کی طبیعت کا مقتضےٰ ہے کہ جو خیال اُس پر غالب ہو دوسرے خیال کو اثر کرنے سے روک دیتا ہے دیکھ لیجئے جب کسی سے سخت خصومت ہوتی ہے تو ہر چند باقتضائے قوت غضبیہ بسا اوقات مخالفت کو قتل کرنے کا خیال پیدا ہو جاتا ہے اور اس خیال کو تائید دینے والے آلات واسباب بھی موجو ہوتے ہیں مگر اُس کے ساتھ ہی قصاص اور انتقام کا خیال اُس خیال سابق پر ایسا غالب آجاتا ہے کہ آدمی قتل پر اقدام نہیں کرسکتا۔ اگر سلطنت کی طرف سے قصاص و انتقام نہ ہو تو معلوم نہیں روز کتنے واردات ہوا کریں۔ غرضکہ آدمی کو خیال سزا و انتقام اکثر جرائم سے روک دیتا ہے اسطرح قوائے شہویہ اور غضبیہ کے ناجائز تصرفات کے وقت خیال انتقام اخروی ایماندار کو ارتکاب جرائم اور خلاف شرع امور سے ضرور روک دے گا جس سے اصلاح تمدن خود بخود ہو جائے گی یہاں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ جب ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے تو چاہئے کہ کسی مسلمان سے ایسے افعال صادر نہ ہوں جو مضر تمدن ہوں۔ اسکا جواب یہ ہے کہ یہ بحث دوسری ہے اسکا تعلق اُن اشخاص سے ہے جن سے افعال صادر ہوتے ہیں ہمارا کلام یہاں نفس ایمان کے ذاتی مقتضیٰ میں ہے سو بفضلہ تعالیٰ اہل انصاف سمجھ

گئے ہوں گے کہ ایمان کا ذاتی مقتضیٰ اصلاح تمدن ہے جس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔

اب ہم چند شہادتیں پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ اصلاح تمدن میں ایمان کی کیسی حیرت انگیز تاثیریں ہیں۔

جب آنحضرت ﷺ کا انتقال ہوا اور مہاجرین و انصار میں مسئلہ خلافت میں بحث شروع ہوئی تو انصار نے اس وجہ سے کہ ملک اُنہی کا تھا مہاجرین سے کہا کہ کم سے کم اتنا تو چاہئیے کہ ہم میں سے بھی ایک امیر ہو مگر عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے انتقال کے پیشتر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھانے کے لئے مقرر فرمایا تھا اب آپ میں سے کس کا نفس گوارا کرتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امامت کرے اُنہوں نے کہا نعوذ باللہ ہم ہرگز اس کو گوارا نہیں کر سکتے چنانچہ اسی پر فیصلہ ہو گیا اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت مسلم ہو گئی۔

اب دیکھئے کہ اسلامی دنیا کی سلطنت صرف ایک بات پر ترک کر دینا خصوصاً ایسے موقع میں کہ ملک سابق سے اپنا ہی ہو کیا کوئی معمولی بات ہے۔ یہ ایمان کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا کہ صرف اس بات پر کہ اپنے نبی ﷺ نے جن کو نماز میں امام بنایا تھا اُنکی امامت کیوں کریں سلطنت چھوڑ دی

اور اُس مہذب قوم میں کسی فرد بشر کی زبان پر یہ نہ آسکا کہ حضرت ﷺ کجا خدمت پیش نمازی اور کجا سلطنت ۔ایمان اسے کہتے ہیں کہ اگر سلطنت ملتی ہو اور معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے نبی ﷺ کے خلاف مرضی ہے تو اُس کی خواہش میں ایک لفظ زبان سے نہ نکل سکے۔اب غور کیا جائے کہ جس قوم کے قوائے شہویہ اور غضبیہ کی تہذیب ایمان نے اس قسم کی کی ہو تو اُن کے اخلاق و عادات کی کیا کیفیت ہوگی اور اُس زمانہ کا تمدن کس اعلیٰ درجہ پر ترقی کیا ہوگا اور کیسا امن و امان قائم ہوا ہوگا۔مولوی شبلی صاحب نے الفاروق میں لکھا ہے کہ جب اہل اسلام نے عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں اکثر مقامات شام کو فتح کر لیا تو قیصر کو نہایت غیرت آئی اور نہایت جوش کے ساتھ آمادہ ہوا کہ شاہنشاہی کا پورا زور عرب کے مقابلہ میں صرف کر دیا جائے ۔چنانچہ روم قسطنطنیہ جزیرہ اور ارمینیہ کی اتنی فوجیں جمع کیں کہ انطاکیہ کے چاروں طرف جہاں تک نگاہ جاتی تھی فوجوں کا ٹڈی دل پھیلا ہوا تھا۔جب ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو اس باب میں متواتر خبریں پہونچیں اور یہ رائے قائم ہوئی کہ حمص چھوڑ کر دمشق روانہ ہوں تو آپ نے حبیب ابن مسلمہ کو جو افسر خزانہ تھے بلا کر کہا کہ عیسائیوں سے جو جزیہ یا خراج لیا جاتا ہے اس معاوضہ میں لیا جاتا ہے کہ ہم اُن کو اُن کے دشمن سے بچا سکیں لیکن

اس وقت ہماری حالت ایسی نازک ہے کہ ہم اُن کی حفاظت کا ذمہ نہیں اُٹھا سکتے اس لئے جو کچھ اُن سے وصول ہوا ہے سب اُن کو واپس دیدو اور اُن سے کہہ دو کہ ہم کو تمہارے ساتھ جو تعلق تھا اب بھی ہے لیکن چونکہ اس وقت تمہاری حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے اس لئے جزیہ جو حفاظت کا معاوضہ ہے تم کو واپس کیا جاتا ہے چنانچہ کئی لاکھ کی رقم جو وصول ہوئی تھی کل واپس کر دی گئی عیسائیوں پر اس واقعہ کا اس قدر اثر ہوا کہ وہ روتے جاتے تھے اور جوش کے ساتھ کہتے جاتے تھے کہ خدا تم کو جلد واپس لائے۔ یہودیوں پر اس سے بھی زیادہ اثر ہوا کہ انہوں نے کہا توریت کی قسم جب تک ہم زندہ ہیں قیصر حمص پر قبضہ نہیں کر سکتا یہ کہہ کر شہر پناہ کے دروازے بند کر دیئے اور ہر جگہ چوکی پہرہ بٹھا دیا۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے صرف حمص والوں کے ساتھ یہ برتاؤ نہیں کیا بلکہ جس قدر اضلاع فتح ہو چکے تھے ہر جگہ لکھ بھیجا کہ جزیہ کی جس قدر رقم وصول ہوئی ہو واپس کر دی جائے۔'' دیکھئے اسلامی تمدن کا یہ اثر تھا کہ دشمنان اسلام مسلمانوں کے ہمدرد اور خیر خواہ ہو گئے اور باوجودیکہ وہ قدیم سے عیسائی سلطنت تھی اور مذہبی جوش ان کا ہنوز فرد نہیں ہوا تھا مگر حسن تمدن نے تھوڑے سے عرصہ میں اُن کو کس قدر گرویدہ بنا لیا تھا کہ وہ دل سے مسلمانوں کے ہوا خواہ بن گئے اور اُنکی

مفارقت پر ایسا روتے تھے جیسے قدیم دوست کی جدائی پر کوئی روتا ہے۔

جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت مسلم ہوگئی اور لوازم تخت نشینی ادا کئے گئے یعنے مہاجرین اور انصار نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی تو دوسرے روز آپ حسب عادت چادروں کا گٹھا لئے ہوئے بازار کو چلے جارہے تھے راستہ میں عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی آپ نے پوچھا کہاں تشریف لے جاتے ہیں۔ فرمایا بازار۔ کہا حضرت آپ خلیفہ وقت اور تمام مسلمانوں کے بادشاہ ہوگئے ہیں اب آپ کو اس کام سے کیا مناسبت فرمایا اگر میں تجارت نہ کروں تو اپنے عیال کو کہاں سے کھلاؤں ، کہا ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس چلئے وہ آپ کے لئے کچھ مقرر کردیں گے چنانچہ دونوں صاحب اُنکے گھر گئے اور درخواست کی انہوں نے کہا میں ایک مہاجر شخص کا قوت آپ کے لئے مقرر کردیتا ہوں نہ اس سے زیادہ نہ کم اور گرما و سرما کا لباس بھی آپکو دیا جائیگا بشرطیکہ جب وہ بوسیدہ ہو جائے تو واپس لادیں اور اُسکے معاوضہ میں نیا لے جائیں۔ پھر دونوں صاحبوں نے مشورہ سے روزانہ آدھی بکری ان کے لئے مقرر کردی مگر اُس میں بھی بحث رہی کہ سر اور پیٹ کا ساماں نہ دیا جائے گا آخر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اُسی پر راضی ہوگئے۔

اب دیکھئے کہ خلیفۃ اللہ دولت اسلامی کے بادشاہ چادروں کا گٹھا اُٹھائے ہوئے قوت حلال کی طلب میں بازار جارہے ہیں۔ پھر ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے گھر اس غرض سے تشریف لیجارہے ہیں کہ اپنی اور اپنے عیال کی قوت بسری کیلئے کچھ مقرر کردیں اور مجال نہیں کہ اُن کے حکم کی مخالفت سر موکریں صرف اس وجہ سے کہ نبی ﷺ نے اُنکو امین ہذہ الامہ فرمایا تھا۔ پھر معمولی لباس اور خوارک کے مقرر کرنے میں بھی اقسام کی شرطیں لگائی جارہی ہیں۔ اور خلیفۃ المسلمین نے یہ بھی نہ کہا کہ آپ ہیں کون اور میرے مقابلہ میں آپ کو حق ہی کیا۔ دیکھئے ایمان کا یہ اثر تھا کہ خلیفہ وقت کو اپنے اقتداری میں تصرف کرنے سے روک کر اپنے محکوم شخص کے حکم کا محتاج بنادیا۔ جہاں بادشاہ کی یہ حالت ہو کہ رعایا کے حقوق سے اپنے حق کی زیادتی سرموگوارانہ ہو تو کیا ممکن ہے کہ کوئی کسی پر زیادتی اور تعدی کرسکے۔

بشریٰ الکرام فی عمل المولد والقیام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ.

اَمَّا بَعْد اولی الابصار واہل بصیرت پر پوشیدہ نہیں کہ جب آفتاب جہاں تاب عالم کو اپنے نور سے معمور کرنا چاہتا ہے تو قبل طلوع طرب وسرور کا ایک بیش بہا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ جدھر دیکھئے دلربایانہ انداز ہے۔ اور فرحت وسرور ومساز۔ صحرا کا خوشنما منظر دل کو وسعت آباد بنا دیتا ہے۔ وحشت خیز پہاڑوں کا سماں بھی دلوں کو لبھانے لگتا ہے۔ نسیم کی مستانہ خیز رفتار ہر شاخ و برگ کو وجد میں لاتی ہے۔ ٹھنڈی ہوا دم بدم قالب میں جان تازہ پھونکتی جاتی ہے۔ تاریکی شب نے حواس کو جو تیرہ تار بنا دیا تھا نورانیت فضا اُنکو پھر نورانی بناتی ہے۔ طیور کے نغمات افسردہ دلوں کو غنچہ کی طرح کھلاتے ہیں۔ وحوش کی گرم جولانیاں دیکھ کر غصہ وفکر دور ہو جاتے ہیں۔ غم ظلمت شب کے ساتھ منور اور دل سرور سے معمور ہوتا ہے یہ سب فیضان، اُس نور کا ہے جو آفتاب عالمتاب کے ساتھ ایک خاص قسم کا تعلق رکھتا ہے۔ اب غور کیجئے کہ جب اجسام کے روشن کرنیوالے آفتاب سے اس قدر فرحت ومسرت ہر طرف جوش زن ہو تو آفتاب روحانی کے قدوم میمنت لزوم سے کسقدر فرحت وسرور کا جوش ہونا چاہئے۔ دیکھئے مبدا کائنات، سرور موجودات ﷺ فرماتے ہیں۔ ’’انا من نور اللہ وکل شئی من نوری‘‘ یعنے میں اللہ کے نور سے بنا اور ہر چیز میرے نور

سے پیدا ہوئی وہی نور ہے جس کی طرف اس آیت شریف میں اشارہ ہے ''
اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاح '' اور ارشاد ہے '' قَدْجَاءَ کُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ '' یہی مقدس نور ہے کہ جب آدم علیہ السلام کی پیشانی میں آیا، ان کو مسجود ملائک بنایا، یہ وہ نور ہے کہ ساکنان ظلمت کدہ عدم کو اس قابل بنایا کہ انوار وجود کا اقتباس کرسکیں۔

اب سنئے کہ اس معنوی اور اصلی نور کے طلوع کے وقت عالم غیب وشہادت میں کس قدر اہتمام ہوا تھا۔ حضرت آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں '' کہ حضرت ﷺ کی ولادت باسعادت کے وقت مجھ سے ایک ایسا نور نکلا کہ اُس سے تمام عالم منورہ ہوگیا۔'' چنانچہ شام کے مکانات مجھے نظر آنے لگے۔

عثمان ابن ابی العاص کی والدہ جو میلاد شریف کی رات حضرت آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں حاضر تھیں ۔ بیان کرتی ہیں کہ قبل ولادت شریف گھر میں جدھر میں نظر ڈالتی تھی نور ہی نور نظر آتا تھا اور اُسوقت ستاروں کی یہ کیفیت محسوس ہوئی تھی کہ گویا وہ اس مکان پر ٹوٹ پڑ رہے ہیں۔

شفا رضی اللہ تعالیٰ عنہا، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی والدہ بیان کرتی ہیں کہ '' اُس نور سے مجھے اسقدر انکشاف ہوا کہ مشرق اور مغرب تک میری نظر پہنچنے لگی اور روم کے مکانات میں نے دیکھے '' ہر چند یہ نور

جسکی خبریں دی گئیں ظاہراً نور ہی تھا مگر اس کی حقیقت کچھ اور ہی تھی ۔بصارت کو ہمرنگ بصیرت کرکے کل جسمانی ظلمات کو منور کردینا معمولی نور کا کام نہیں، یہ آفتاب کا نور نہ تھا کہ اجسام کی سطح بالائی پر ٹھیر جاتا بلکہ یہ اُس ذات مقدس کا نور تھا جو انا من نور اللہ کی مصداق ہے یہ نور اجسام کے اندر سرایت کئے ہوئے تھا غرضکہ اُس روز عالم میں ایک خاص قسم کی روشنی ہوئی تھی جسکے ادراک میں عقل خیرہ ہے۔اوراُس روز ملائکہ کو حکم ہوا تھا کہ تمام آسمانوں کے اور تمام جنتوں کے دروازے کھول دیں اور زمین پر حاضر ہو جائیں۔چنانچہ کل ملائکہ کمال مسرت سے زمین پر اُتر آئے۔

اُس روز نہر کوثر پر ستر ہزار خوشبو کے جھاڑ نصب کئے گئے تھے جنکا ثمر اہل جنت کے لئے بخور بنایا جائے گا۔اس واقعہ کی یادگار میں ہر آسمان پر ایک ستون زمرد کا اور ایک ستون یاقوت کا نصب کیا گیا۔اُس رات میں شیاطین مقید کئے گئے۔کاہنوں کی خبریں بند ہوگئیں سارے جہاں کے بُت سربسجود ہوئے۔فارس کے آتش کدے جنکی پرستش سالہا سال سے ہوتی تھی بجھ گئے۔ماہران نجوم ہر طرف خبریں دینے لگے کہ آج نبی آخرالزماں ﷺ کا ستارہ طلوع ہوا اور قوم بنی اسرائیل سے نبوت جاتی رہی اب عرب وعجم نبی آخرالزماں ﷺ کے مطیع اور فرماں بردار ہوجائیں گے۔

اُس رات بادشاہوں کے تخت نگونسار ہو گئے۔ ایوان کسریٰ کو زلزلہ ہوا جس سے چودہ کنگرے اس کے گر گئے، زبان اشارت یہ کہہ رہی تھی کہ بادشاہ وقت کے چودہ پشت تک سلطنت رہے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ چودھویں پشت کے بعد ملک کسریٰ مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔

غرضکہ اس مبارک رات میں اس قسم کے بہت سے قدرتی اہتمام ایسے ظہور میں آئے۔ کہ جنکی نظیر نہیں مل سکتی۔ فی الحقیقت آنحضرت ﷺ کی شان ہی ایسی تھی کیونکہ آپ باعث ایجاد عالم و آدم ہیں۔ جیسا کہ لولاک لما خلقت الا فلاک اور لولاک لما خلقتک سے ظاہر ہے۔

نبوت جو سلطنت خدائی میں اعلیٰ درجہ کا منصب ہے اس کا سلسلہ آپ ہی سے شروع ہوا جیسا کہ حضرت ﷺ فرماتے ہیں کنت نبیا و آدم بین الماء والطین۔ اور ایک روایت میں ہے کنت نبیا و آدم بین الروح والجسد یعنے میں اُس وقت نبی تھا کہ آدم علیہ السلام ہنوز پیدا نہیں ہوئے تھے پھر انبیاء گویا آپ کے امتی بنائے گئے۔ کیونکہ آپ پر ایمان لانے کا صرف حکم ہی نہیں بلکہ نہایت شد و مد سے اقرار لیا گیا۔ کما قال اللہ وَاِذْ اَخَذَاللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَا آتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتَابٍ وَ

حِکْمَۃٍ ثُمَّ جَائَکُمْ رَسُوْلٌ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ قَالَ ءَ اَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ قَالُوْا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْھَدُوْا وَاَنَا مَعَکُمْ مِّنَ الشَّاھِدِیْنَ.

یعنے جب لیا اللہ نے اقرار نبیوں کا کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا کتاب اور علم پھر آئے تمہارے پاس رسول جو سچ بتادے اُس کو جو تمہارے پاس ہے تو البتہ ایمان لاؤ اُس پر اور البتہ مدد دینا ان کو فرمایا۔ کیا تم نے اقرار کیا اور لیا تم نے اس پر بھاری عہد میرا۔ کہا انہوں نے اقرار کیا۔ ہم نے فرمایا تو اب شاہد رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ شاہد ہوں انتہی

اس سے ظاہراً تمام انبیا علیہم السلام کا حضرت ﷺ کے امتی ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اسی وجہ کل انبیاء علیہم الصلواۃ والسلام قیامت میں حضرت کے جھنڈے کے نیچے رہیں گے۔ اور شب معراج حضرت ﷺ کی شان تمام انبیاء کو بتلادی گئی۔ چنانچہ سب کے امام آپ ہی بنائے گئے اور سب نے آپ کی اقتدا کی کل انبیا کا یہ حال ہو، تو انکی امتوں کے امتی ہونے میں کیا تامل۔ اسی وجہ سے فرماتے ہیں۔ بعثت الی الناس کافۃ یعنی کل انسانوں کی طرف میں مبعوث ہوا ہوں۔ اور حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَافَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَنَذِیْرًا یعنے ہم نے تم کو سب

آدمیوں کے واسطے بھیجا۔ خوشی اور ڈر سنانے کو۔ ہر چند معنوی طور پر موسیٰ علیہ السلام حضرت کی امت میں داخل تھے مگر جب توریت میں حضرت ﷺ کی خاص امت کے فضائل پر مطلع ہوئے تو دعا کی کہ ظاہری طور پر بھی حضرت کی امت میں داخل ہوں، عالم ملکوت میں آپ کی نام آوری اور شہرت کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ کہ حق تعالیٰ نے اپنے نام مبارک کے ساتھ آپ کا نام نامی یعنے محمد رسول اللہ ﷺ عرش پر اور ہر ایک آسمان میں جگہ جگہ اور جنت کے جھاڑوں اور طوبیٰ اور سدرۃ المنتہیٰ کے ہر ایک پتے پر اور حوروں کے سینوں اور فرشتوں کے جبینوں پر لکھا، جب تک کہ آدم علیہ السلام نے حضرت کے واسطے سے یہ کہہ کر دعا نہ کی کہ یارب بحق محمد ﷺ لما غفرت لی معافی نہ ہوئی۔

یہ اور ان کے سوا بہت سی روایتیں الخصائص الکبریٰ۔ اور النہجۃ السویہ اور مواہب لدنیہ اور شفاء قاضی عیاض وغیرہ میں مذکور ہیں جن سے ثابت ہے کہ حضرت کا نام مبارک محمد ﷺ علی مسماہ تمام عالم ملکوت والسموات میں لکھا ہوا ہے۔ مقصود اس سے ظاہر ہے کہ اہل ملکوت وغیرہم معلوم کرلیں کہ تمام عالم میں حضرت سے زیادہ کوئی اللہ تعالیٰ کا محبوب نہیں۔ چنانچہ آدم علیہ السلام نے یہی خیال کر کے حضرت ﷺ کے نام کے وسیلہ سے

مغفرت چاہی۔

اب یہ دیکھ لیجئے کہ یہ نام مبارک حضرت ﷺ کے لئے کیوں تجویز فرمایا گیا۔ بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو حمد نہایت محبوب اور مرغوب ہے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے اسی وجہ سے قرآن شریف کی ابتداء الحمدلله رب العالمین سے ہے جس کے معنی یہ ہیں ہر طرح کی۔ حمد خدا ہی کو سزاوار ہے جو تمام جہان کا پروردگار ہے۔ اور نماز جو تمام عبادتوں میں اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے۔ اسکی ابتدا بلکہ ہر رکعت کی ابتدا میں الحمد پڑھنے کا حکم ہے۔ اور اہل ایمان جب جنت میں جائیں گے تو حمد کرتے ہوئے جائیں گے کما قال الله تعالی، وَآخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ یعنی آخر پکارنا اُن کا یہ ہے کہ سب تعریف واسطے اللہ کے ہے جو پروردگار سارے جہان کا ہے۔ انتہیٰ۔

اب دیکھئے کہ تمام حمد جب حق تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں جن کا مطلب یہ ہوا کہ سب حامد ہیں۔ اور حق تعالیٰ محمود ہے۔ تو اللہ تعالےٰ کے محمد ﷺ یعنے حمد کردہ شدہ ہونے میں کیا تامل۔ باوجود اسکے یہ پیارا لقب حق تعالیٰ نے ازل سے حضرت ﷺ کے لئے خاص فرمایا اور ابتدائی تکوین عالم سے عالم ملکوت میں اُسکی شہرت دی تا کہ اہل ملکوت پر یہ منکشف ہو جائے کہ

جس لفظ کے معنی کا مصداق جناب باری ہو وہ لفظ جس کے لئے تجویز کیا گیا وہ ضرور ایسے ہوں گے کہ عالم میں انکا نظیر نہ ہوگا۔ اس سے بکمال وضاحت یہ بات ثابت ہوگئی کہ عالم میں حضرت ﷺ کا مثل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اب ممکن نہیں کہ کوئی دوسرا شخص ازل سے محمد ﷺ ہوسکے۔ اور اِس سے یہ بھی صاف طور پر معلوم ہوا کہ جتنی تعریف و توصیف آنحضرت ﷺ کی، کی جائے وہ باعث خوشنودی الٰہی ہے کیونکہ اس لقب کے عطا کرنے سے اور کیا مقصود ہوسکتا ہے۔ اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ اشعار نعتیہ سے خوش ہوتے تھے۔ جس کا منشا خوشنودی الٰہی تھا۔ النہجتہ السویۃ میں لکھا ہے کہ حضرت ﷺ کی امت کا لقب کتب سابقہ میں حمادین ہے تعجب نہیں کہ اِس لقب سے اس طرف بھی اشارہ ہو کہ اپنے نبی محمد ﷺ کی حمد وہ کثرت سے کریں گے۔ اگرچہ کہ حضرت ﷺ کے بہت سارے نام ہیں مگر چونکہ یہ پیارا نام حق تعالیٰ کو نہایت محبوب ہے اس لئے ایمان سے اس کو کمال درجہ کا تعلق ہے۔ چنانچہ النہجتہ السویۃ میں لکھا ہے کہ کافر جب تک محمد رسول ﷺ نہ کہے اس کا ایمان صحیح نہیں۔ اور بجائے اُس کے احمد ﷺ کہنا کافی نہیں ہوسکتا۔ اس میں سر یہی ہے کہ ایمان لانے ہی کے وقت آدمی سمجھ جائے کہ حضرت قابل حمد وثنا ہیں اور حمد

زبان اور دل سے کیا کرے ۔ اور اسی میں بیہقی کی روایت نقل کی ہے کہ ایک جگہ محدثین کا مجمع تھا یہ مسئلہ پیش ہوا کہ عرب کے اشعار میں کونسا شعر عمدہ ہے ۔ سب کا اتفاق حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے اس شعر پر ہوا ۔

وشق لہ من اسمہ لیجلہ فذو العرش محمود وھذا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

یعنے حق تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت شان بتلانے کے لئے اُن کا نام اپنے نام سے مشتق کیا چنانچہ حق تعالی محمود ہے اور ہمارے نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں چونکہ لفظ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معنی میں کمال درجہ کی جلالت شان معلوم ہوتی ہے جیسا کہ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے شعر سے بھی ظاہر ہے ۔ اس لئے ابن موطی نے اُس کے فہم معنی میں متحیر ہوکر یہ تجویز کی کہ وہ علم مرتجل ہے (علم مرتجل اس کو کہتے ہیں کہ لفظ بغیر مناسبت کے دوسرے معنی میں نقل کیا جائے جیسے جعفر کہ نہر کے لئے موضوع تھا اور بعد میں کسی کا نام رکھا گیا ۔ منقول اس کو کہتے ہیں کہ نقل کے وقت معنی سابق کی مناسبت ملحوظ ہو ۔ ۱۲) مگر النہجۃ السویہ میں لکھا ہے کہ علما نے اُن کی غلطی ثابت کی اور کہا کہ وہ منقول اور باب تفعیل سے اسم مفعول ہے جس کے معنی حمد کردہ شدہ ہیں ۔ اور صحاح میں لکھا ہے کہ للمحمد الذی کثرت خصالہ الحمیدہ انتھیٰ ۔ غرضکہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ازل سے ہر ایک موطن ومقام

میں ممتاز اور محمد ﷺ رہے۔ النبجۃ السویۃ میں لکھا ہے کہ جس رات آپ پیدا ہوئے ملائکہ آپ ﷺ کو خلیفۃ اللہ کہتے تھے۔ دیکھئے حق تعالی نے ملائکہ سے آدم علیہ السلام کے باب میں فرمایا تھا اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً جس سے ظاہر ہے کہ اُن کی خلافت صرف زمین سے متعلق تھی۔ لیکن فرشتے چونکہ افلاک وغیرہ میں دیکھتے تھے کہ حضرت ﷺ کا نام مبارک حق تعالیٰ کے نام مقدس کے ساتھ ہر جگہ مکتوب ہے۔ اس لئے انہوں نے اُن کو علی الاطلاق خلیفۃ اللہ کہہ دیا۔ اور فِی الْاَرْضِ کی قید جو آدم علیہ السلام کی خلافت میں ملحوظ تھی نہیں لگائی فرشتوں کی اس گواہی سے ثابت ہے کہ حضرت ﷺ کل ملکوت میں خلیفۃ اللہ ہیں۔ اسی وجہ سے تمام آسمانوں کے ملائک اِس خلیفۃ اللہ کے سلام کے لئے روز میلاد حاضر ہوئے جن کا نزول اجلال تمام عالم کے حق میں رحمت تھا جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ جب آپ رحمت مجسم ہو کر اس عالم میں تشریف لائے تو کون ایسا شقی ہوگا کہ نزول رحمت سے خوش نہ ہو۔ روایت ہے کہ تمام عالم میں اُس روز ہر طرف خوشی تھی مگر شیطان کو کمال درجہ کا غم تھا جس سے زار زار روتا تھا۔ جبرئیل علیہ السلام، اُس کی یہ حالت دیکھ کر رہ نہ سکے اور ایک ایسی ٹھوکر اس

کو ماری کہ عدن میں جا پڑا ۔غرضکہ جس طرح میلاد شریف کا غم کمال شقاوت کی دلیل ہے اُس کی مسرت کمال سعادت کی دلیل ہوگی ۔جیسا کہ اِس روایت سے ظاہر ہے جو کنزالعمال وغیرہ میں مذکور ہے کہ ابولہب کو جب ثویبہ نے جو اُس کی لونڈی تھی خبر دی کہ تمہارے بھائی عبداللہ رضی اللہ عنہ کو لڑکا پیدا ہوا اُس کو اس خبر فرحت اثر سے نہایت خوشی ہوئی اور اس بشارت کے صلہ میں اُس کو آزاد کر دیا۔ابولہب کے مرنے کے بعد کسی نے اُس کو خواب میں دیکھا اور حال دریافت کیا تو اُس نے اپنے معذب ہونے کا حال بیان کر کے کہا کہ ہر دوشنبہ کی رات اُس خوشی کے صلہ میں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا ہونے میں ہوئی تھی مجھ سے عذاب کی تخفیف ہو جاتی ہے اور میری اونگلیوں سے پانی نکلتا ہے جس کو چوسنے سے تسکین ہوتی ہے ۔دیکھئے جب ایسا ازلی شقی جس کی مذمت میں ایک کامل سورہ تبت یدا ابی لھب نازل ہوئی میلاد شریف کی مسرت ظاہر کرنے کی وجہ سے ایک خاص قسم کی رحمت کا مستحق ہوا اور وہ بھی کہاں عین دوزخ میں تو خیال کیا جائے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیوں کو اِس اظہارِ مسرّت کے صلہ میں کیسی کیسی سرفرازیاں ہوں گی ۔اِسی مضمون کو حافظ شمس محمد بن ناصر الدین دمشقی رحمۃ اللہ علیہ نے نظم میں لکھا ہے۔

اذا کان ھذا کافراً جاء ذمہ وتبت یداہ فی الجحیم مّخلدا

اتی انہ فی یوم الاثنین دائما یخفف منہ للسرور باحمدا

فماالظن بالعبد الذی کان عمرہ باحمد مسروراً ومات موحدا

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر چند ولادت شریف ایک معین دوشنبہ کے روز ہوی مگر اُس کا اثر ہر دوشنبہ میں مستمر ہے اِس لحاظ سے اگر ہر دوشنبہ اظہار مسرت کے لئے خاص کیا جائے تو بے موقع نہ ہوگا۔

کم سے کم سال میں ایک بار تو اظہار مسرت ہونا چاہئے اسی وجہ سے حرمین شریفین میں روز دوازدہم شریف نہایت اہتمام سے ہوتا ہے یہاں تک کہ اُس روز اور عیدوں کی طرح خطبہ پڑھا جاتا ہے اور تمام مسلمان خوشیاں مناتے ہیں خصوصاً مدینہ طیبہ میں تو دور دور سے قافلے پر قافلے چلے آتے ہیں۔ اور مراسم عید ادا کئے جاتے ہیں۔ اور مکہ معظّمہ میں ایک لطف خاص قابل دید یہ ہے کہ ہر فرقے اور حرفے کے لوگ مسجد الحرام سے قبہ مولدالنبی ﷺ میں جوق جوق ممتاز ہوکر جاتے ہیں۔ اور وہاں مولود شریف پڑھ کر شیرنی وغیرہ تقسیم کرتے ہیں۔ بمصداق لَمَّا رَاٰہُ الْمُسْلِمُوْنَ حَسَناً فَھُوَ عِنْدَاللہ حَسَنٌ مورد تحسین ہوتے ہیں شیخ نجم الدین غیطی رحمتہ اللہ علیہ نے رسالہ مولود شریف میں ابن عباس رضی اللہ

تعالیٰ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ولادت اور ابتدائے نبوت اور ہجرت اور مدینہ شریف میں داخل ہونا اور وفات شریف یہ سب امور دوشنبہ کے روز واقع ہوے حضرت ﷺ کے معاملات میں یہ ایسا روز ہے جیسے آدم علیہ السلام کے حق میں جمعہ تھا کہ ان کی پیدائش۔ زمین پر اُترنا۔ توبہ کا قبول ہونا۔ اور وفات سب جمعہ کے دن ہوئے۔ اس وجہ سے ایک ساعت جمعہ میں ایسی ہے کہ جو دعا اُس میں کی جائے قبول ہوتی ہے تو خیال کرو کہ سید المرسلین ﷺ کی ساعت ولادت میں اگر دعا قبول ہو تو کونسی تعجب کی بات ہوگی انتہیٰ۔ علماء نے اختلاف کیا ہے کہ میلاد شریف کی رات افضل ہے یا شب قدر جن حضرات نے میلاد شریف کی رات کو افضل کہا ہے اُنکے دلائل یہ ہیں کہ لیلۃ القدر کی فضیلت اس وجہ سے ہے کہ ملائکہ اس میں اُترتے ہیں جیسا کہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے لَیْلَۃُ الْقَدْرِ خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَھْرٍ تَنَزَّلُ الْمَلَائِکَۃُ وَالرُّوْحُ فِیْھَا اور شب میلاد میں سید الملائکہ والمرسلین ﷺ کا نزول اجلال اس عالم میں ہوا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ فضیلت شب قدر میں نہیں آسکتی۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ شب قدر حضرت ﷺ کو دی گئی اور شب میلاد میں خود حضرت ﷺ کا ظہور ہوا جن کی وجہ سے شب قدر کو فضیلت حاصل ہوئی اور ظاہر ہے کہ جو چیز ذات

سے متعلق ہو بہ نسبت اُس چیز کے جو عطا کی گئی افضل ہوگی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ شب قدر کی فضیلت صرف حضرت ﷺ کی امت سے تعلق ہے اوروں کو اِس سے کوئی تعلق نہیں۔ اور شب میلاد تمام موجودات کے حق میں نعمت ہے اس لئے کہ اس میں رحمۃ للعالمین کا ظہور ہے جو کل موجودات کے حق میں نعمت عظمیٰ ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ جس طرح ابولہب کے حق میں ہر دوشنبہ کی رات میں برکت مکرر ہوتی ہے ہر دوشنبہ کی رات یا ہر تاریخ ولادت کی رات میں وہ فضیلت مکرر ہوتی ہے یا نہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ نفس شب قدر سے شب میلاد افضل ہے۔

اب مولود شریف کے جواز اور استحباب کی دلیلیں سنئے۔ نجم الدین غیطی رحمتہ اللہ علیہ نے شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ ہر سال مولود شریف معین روز میں کرنے کی اصل بخاری اور مسلم کی روایت سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ جب حضرت ﷺ مدینہ منورہ تشریف لے گئے دیکھا کہ یہود عاشورہ کے روز روزہ رکھا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ اُن سے دریافت کی انہوں نے کہا کہ یہ روز وہ ہے کہ اس میں خدائے تعالیٰ نے فرعون کو غرق کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو نجات دی۔ اس لئے اس کے شکریہ میں عاشورہ کے روز ہم لوگ روزہ رکھا کرتے ہیں آپ ﷺ نے

فرمایا نحن احق بموسیٰ منکم یعنے تم سے زیادہ ہم اس کے مستحق ہیں۔ چنانچہ آپ نے بھی اس روز روزہ رکھا اور صحابہ کو بھی اس کا حکم فرمایا، اِس سے ظاہر ہے کہ جب کوئی اعلیٰ درجہ کی نعمت کسی معین روز میں حاصل ہوئی ہو اُس کی ادائی شکر اس روز کے نظیروں میں کرنا مسنون ہے اور چونکہ کوئی نعمت رحمۃ للعالمین ﷺ کی ولادت باسعادت سے افضل نہیں ہوسکتی اس لئے بہتر ہے کہ اس شکریہ میں اقسام کی عبادتیں مثل صدقات اوراطعام طعام وغیرہ روز میلاد شریف ادا کی جائیں۔ انتہیٰ۔ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ سے پیشتر حافظ ابن رجب حنبلی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی کے قریب قریب جواز مولود پر استدلال کیا ہے امام سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ دوسری اصل مولود شریف کی یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خود بنفس نفیس اپنا عقیقہ ادا فرمایا باوجودیکہ روایات سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ کے جدامجد عبدالمطلب نے ساتویں روز آپ کا عقیقہ کیا تھا ۔اور یہ بھی ثابت ہے کہ عقیقہ دوبارہ نہیں کیا جاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت کو اس اعادہ عقیقہ سے یہ معلوم کرنا منظور تھا کہ اعلیٰ درجہ کی نعمت پر اگر اعادہ شکر کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ اس لئے میلاد شریف کے روز اظہار شکر میں کھانا کھلانا اور اظہار مسرّت کرنا مستحب ہے انتہیٰ۔

رسالہ اتمام النعمۃ الکبریٰ علی العالم بمولد المصطفیٰ ﷺ ، میں حافظ ابن حجر مکی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن جرزیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ مولود شریف کی اصل خود آنحضرت ﷺ سے ماثور ہے۔ مولود کی فضیلت کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ اس میں ارغام شیطان اور سرور اہل ایمان ہے انتہیٰ۔ آپ نے دیکھ لیا کہ ان علماء کی تصریحات سے ظاہر ہے کہ جس سے اُس کا مسنون اور مستحب ہونا ثابت ہوتا ہے۔

شیخ الاسلام عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے صوم عاشورہ سے جو استدلال کیا ہے اس میں غور کیجئے کہ باوجودیکہ موسیٰ علیہ السلام کی کامیابی ایک معین عاشورہ میں ہوئی تھی۔ مگر تمام سال کے ایام میں صرف اُسی روز کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس نعمت کا شکریہ اسی روز مکرر ہر سال ادا کیا جائے جس سے ثابت ہے کہ گو واقعہ مکرر نہیں مگر اُس کی برکت کا اعادہ ضرور ہوتا ہے جس پر دلیل یہ ہے کہ ہر دوشنبہ میں ابولہب کے لئے اُس کی برکت کا اعادہ ہوتا ہے۔

بعضے علماء نے یہاں پر یہ کلام کیا ہے کہ صوم عاشورہ منسوخ ہو گیا ہے اس لئے اس کی فضیلت باقی نہیں رہی ۔اس کا جواب یہ ہے کہ رمضان شریف کے روزوں کی فرضیت کے بعد اب کسی روزہ کی فرضیت نہ رہی

۔اس سے صوم عاشورہ کی علت جو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر تھی اُس میں کوئی فرق نہیں آیا اس لئے کہ اس کے منسوخ کرنے کے وقت حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ نَحۡنُ لَسۡنَا اَحَقُّ بِمُوۡسیٰ مِنۡکُمۡ جس طرح روزہ رکھنے کے وقت نَحۡنُ اَحَقُّ بِمُوۡسیٰ مِنۡکُمۡ فرمایا تھا اور نہ یہ فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ گزر کر ایک زمانہ ہو گیا۔ ہر سال اُس کا لحاظ رکھنا جائز نہیں کیونکہ اس میں اعادہ معدوم نظر آتا ہے۔ پھر باوجود اُس روزے کے منسوخ ہونے کے احادیث میں اُس کے فضائل وارد ہیں جس سے ثابت ہے کہ روزے کا حکم فرمانے کے وقت جو فضیلت ملحوظ تھی وہ اب بھی ملحوظ ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ فضائل منسوخ نہیں ہو سکتے اس لئے شیخ الاسلامؒ کے استدلال پر اس کے منسوخ ہونے کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اور اگر تسلیم کر لیا جائے کہ اُس روزہ کی فضیلت بھی منسوخ ہو گئی تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ اس لئے کہ موسیٰ علیہ السلام کی نجات کی بے حد خوشی اگر ہو تو اُن لوگوں کو ہو گی جن کو اُن کے امتی ہونے کا دعویٰ تھا یعنے یہود کو ہمیں اُسکی کیا ضرورت اگر انبیائے سابق کے اس قسم کے واقعات کی خوشی ہم پر لازم ہو تو ہفتہ کے تمام ایام انہی خوشیوں میں صرف ہو جائیں گے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اِس روزہ سے صرف امت کو توجہ دلانا مقصود معلوم ہوتا

ہے کہ جب ہم ایک نبی کی نجات پر شکریہ ادا کرتے ہیں تو تم کو ہماری ولادت کی بے حد خوشی کرنی چاہیئے۔ مگر طبع غیور کو صراحتاً یہ فرمانا گوارا نہ تھا کہ ہمارے میلاد کے روز تم لوگ روزہ رکھا کرو بلکہ خود ہی اس شکریہ میں روز دوشنبہ ہمیشہ روزہ رکھا کرتے تھے۔ اور اُس کی وجہ اُس وقت تک نہیں بتائی کہ کسی نے نہیں پوچھا اس لئے کہ بغیر استفسار کے بیان کرنا بھی طبع غیور کے مناسب حال نہ تھا۔ یہ بات مسلم شریف کی اس روایت سے ظاہر ہے کہ جب حضرت ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ آپ ﷺ دوشنبہ کا روزہ کیوں رکھا کرتے ہیں فرمایا ''کہ وہ میری ولادت کا روز ہے اور اُس روز مجھ پر قرآن نازل ہوا''۔ انتہیٰ۔ اب غور کیجئے کہ جب خود بدولت ہمیشہ روز میلاد میں شکریہ کا روزہ رکھا کرتے تھے تو ہم لوگوں کو کس قدر اِس شکریہ کی ضرورت ہے اِس لئے کہ حضرت کا وجود ہم لوگوں کے حق میں نعمت عظمیٰ ہے اور اگر یہی لحاظ ہوتا کہ اپنی ولادت کا شکریہ ضرور تھا، تو فرمادیتے کہ ہر شخص اپنی ولادت کے روز شکریہ کا روزہ رکھا کرے حالانکہ کسی روایت میں یہ وارد نہیں ہوا۔ اِس سے ظاہر ہے کہ اس میں عمومی نعمت کا لحاظ تھا اور اُس سے صرف تعلیم امت مقصود تھی اس نعمت عظمیٰ کا شکریہ ہر ہفتہ میں ادا کیا جائے۔ مرقاۃ شرح مشکوۃ میں ملا علی قاری نے طیبیؒ کا قول

نقل کیا ہے کہ جس روز نبی ﷺ کا وجود اس عالم میں ہوا اور کتاب عنایت ہوئی تو روزہ کے لئے اُس روز سے بہتر کون سا روز ہوسکتا ہے ۔ غرضکہ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ میلاد مبارک کا شکریہ ہر ہفتہ میں ادا کیا جائے ۔ پھر اگر سال میں بھی ایک بار اِس نعمت عظمیٰ کا شکریہ ادا نہ کیا جائے تو کس قدر بدنصیبی اور بے قدری ہے ۔ غرضکہ تکرار زمانے میں گو اعادہ معدوم نہیں مگر ابتدائی فضیلت اُس میں ضرور ملحوظ ہوتی ہے ۔ دیکھئے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام جب مذبوح ہونے سے بچائے گئے جس کے سبب سے حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہم السلام کو خوشی ہوئی ہر سال اس خوشی کا اعادہ ہوا کرتا ہے ۔ اِس سے بڑھ کر کیا ہو کہ اُس دن عید ہوتی ہے اور اس واقعہ کے پیش نظر ہوجانے کے لئے جس قسم کے افعال و حرکات اُن حضرات اور حضرت بی بی ہاجرہ رضی اللہ عنہا سے صادر ہوئے اسی قسم کے حرکات کے ہم لوگ حج میں مامور ہیں ۔ چنانچہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے پانی کی تلاش میں صفا و مروہ میں سات چکر کئے تھے ۔ ہم کو بھی حکم ہے کہ اس وسیع میدان میں سات چکر کیا کریں ۔ میلین اخضرین کے مقام میں وہ دوڑی تھیں ہمیں بھی وہاں دوڑنے کا حکم ہے اسی طرح اور بہت سے افعال ہیں جن سے وہ اصلی واقعہ پیش نظر ہوجاتا ہے ۔ اب اگر مولود شریف کے

وقت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف فرمائی مسلمانوں کے پیش نظر ہو اور تعظیم کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں تو ایسی کونسی بے موقع حرکت ہوگی جس سے لعن وطعن کیا جاتا ہے اور اقسام کے الزام لگائے جاتے ہیں کہ یہ لوگ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بار بار پیدا ہونے کے قائل ہیں ہم پوچھتے ہیں کیا حجاج دنبہ کو ذبح کرنے کے وقت اسمعیل علیہ السلام کے بار بار ذبح کرنے کا خیال کرتے ہیں۔

حالانکہ یہ گویا حکایات اُسی کی ہے۔

بخاری شریف کی کتاب الانبیاء میں روایت ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ سفر غزوہ تبوک میں جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر مقام حجر پر ہوا تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی وہاں کے حالات پر اطلاع ہوئی اور فرمایا کہ صالح علیہ السلام کی اونٹنی فلاں کوئیں کا پانی پیا کرتی تھی۔قوم نے اُسکو اس وجہ سے قتل کرڈالا کہ وہ ایک روز سب پانی پی جاتی تھی حضرت صالح علیہ السلام نے بہت بار منع کیا مگر انھوں نے نہ مانا اس پر عذاب نازل ہوا اور وہ سب ہلاک کیئے گیئے۔اب تم لوگ اُس کوئیں پر اترو جو اونٹنی کے لئے خاص تھا۔ اور دوسرے کوئیں کے پانی سے احتراز کرو صحابہ نے عرض کیا کہ ہم نے تو اس کوئیں کے پانی سے آٹا گوندھ لیا ہے فرمایا وہ خمیر اور بچا ہوا پانی سب

پھینک دو اور اُس کوئیں کا پانی لو جو اونٹنی کے لئے خاص تھا۔ پھر فرمایا کہ اُس قوم کی سکونت گاہ میں جب پہونچو تو روتے ہوئے وہاں سے جلد گزر جاؤ۔ اور اگر رونا نہ آئے تو بتکلف روؤ۔ اس خوف سے کہ کہیں تم پر ان کا عذاب نہ ہو جائے۔ چنانچہ جب اُس قوم کے مکانات پر پہونچے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر سے اپنا سر مبارک ڈہانک لیا اور اونٹنی کو دوڑایا یہاں تک کہ اُس وادی سے نکل گئے (یہ خلاصہ اُن روایتوں کا ہے جو بخاری اور فتح الباری اور تفسیر ابن جریر وغیرہ میں مذکور ہیں) اسی طرح مسلم وغیرہ کی روایتوں سے ثابت ہے کہ حج میں وادی محسر جہاں اصحاب فیل ہلاک ہوئے تھے وہاں سے جلد گزر جانا مسنون ہے۔ اب غور کیجئے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اُس مقام میں جو خوف طاری ہوا اور سب کو رونے کا حکم فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہایت تواضع کی حالت میں چادر مبارک سے سر ڈہانکے ہوئے نہایت جلدی سے اُس مقام سے نکل گئے کیا یہ خیال ہوسکتا ہے کہ اُن برگزیدگان حق پر اُسوقت سچ مچ عذاب اُترتا وہ بھی ایسی حالت میں کہ صرف خوشنودی خدا اور رسول کی غرض سے راہ خدا میں جان دینے کو چلے جارہے ہیں۔ اور تنہا بھی نہیں بلکہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھے جنکی شان میں وارد ہے مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبُهُمْ وَاَنْتَ فِيُهِمْ یعنے خدائے

تعالٰی اُن لوگوں پر عذاب نہیں کرتا جن میں آپ ہیں پھر حضرت کو اُس خوف سے کیا تعلق جو خود بھی جلدی سے وہاں سے گزر گئے کیا کوئی ضعیف الایمان بھی اس موقعہ میں ناشائستہ خیال کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ پھر یہ تمام آثار جو اصلی واقعہ کہ وجود کے وقت مرتب ہونے کے لائق ہیں اسوقت کیوں ظہور میں آئے؟ کیا اُسوقت اُس قوم پر عذاب اوتر رہا تھا جسکے دیکھنے سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر کوئی شخص بے باکانا اُس مقام میں چلا جائے تو اندیشہ ہے کہ مبتلائے عذاب ہوجائے اِس لئے کمال خضوع سے روتے ہوئے جانے کی ضرورت ہوئی تاکہ خدائے تعالٰی اِس عذاب سے بچالے اس سوال کا جواب سوائے اِسکے کچھ نہیں کہ صرف اصلی واقعہ اُسوقت پیش نظر ہوگیا تھا۔ جس پر آثار خوف مرتب ہوئے۔ پھر یہ حضرت ﷺ نے اپنی رائے سے بھی نہیں فرمایا اسلئے کہ اُس ویران مقام میں کیونکر معلوم ہو کہ اونٹنی کا کواں کونسا اور قوم کے کوئیں کونسی ہیں جن سے پانی لینے کی ممانعت ہوئی بلکہ یہ سب وحی سے معلوم ہونے کی باتیں ہیں۔ اِس سے ثابت ہے کہ یہ سب تعلیم الٰہی تھی۔ اب فرمائے کہ اُسوقت جو صرف اصل واقعہ کے پیش نظر ہونے سے حکم تھا کہ خوف وخضوع ظاہر کریں۔ اس طرح میلاد شریف کے پیش نظر ہونے کے وقت آثار فرحت و تعظیم ظاہر

کیئے جائیں تو خدا اور رسول کی مرضی کے مخالف ہونے کی کیا وجہ؟ کیا یہ حدیث صحیح نہیں ہے کہ صحابہ سے آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا: قوموا الی سید کم۔ غرضکہ یہ ہرگز ثابت نہیں ہوسکتا کہ میلاد شریف کے وقت جو قیام کیا جاتا ہے وہ شرک یا مکروہ ہے۔

تخیل اور تصور پر آثار کا مرتب ہونا فطرت انسانی میں داخل ہے جیسے کسی خوشی کے واقعہ کے خیال کرنے پر آثار بشاشت چہرہ سے نمایاں ہوتے ہیں اور غم کا واقعہ یاد کرنے سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ کنزالعمال میں روایت ہے کہ ایک روز عمر رضی اللہ عنہ نے صبح کی نماز میں سورہ یوسف شروع کی جب اِس آیت پر پہونچے وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے غم و بکا کا ذکر ہے۔ آپ پر ایسا گریہ طاری ہوا کہ آگے پڑھ نہ سکے آخر رکوع کر دیا۔ شریعت میں بھی اِس تخیل اور تصور کا اعتبار اور لحاظ کیا گیا ہے۔ چنانچہ جامع الصغیرہ میں اِس مضمون کی روایتیں مذکور ہیں کہ حضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ کسی کا نام محمد ﷺ رکھو تو اُس کا اکرام کرو اور اُس کو بُرا مت کہو اور اذیت نہ پہنچاؤ۔ دیکھئے نام جو صرف الفاظ ہیں ان میں یہ اثر کہاں سے آگیا کہ اپنے مسمیٰ کو ایسی عزت بخشے۔ دراصل یہ اُس تخیل کا اثر ہے جو اِس لفظ کی تذکر کے

وقت آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک پیش نظر ہو جاتی ہے۔ یہ بحث کسی قدر بسط سے ہم نے انوار احمدی میں لکھی ہے۔

فتح الباری میں شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حج میں جو تلبیہ یعنے لبیک کہا جاتا ہے اسکی وجہ احادیث میں یہ وارد ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یعنے لوگوں میں پکار دو کہ حج کیلئے آئیں چنانچہ اُنہوں نے پکار دیا۔ اب جو لبیک کہا جاتا ہے اُسی کا جواب ہے دیکھئے یہ لبیک حالت حرام میں کس خشوع خضوع سے کہا جاتا ہے۔ اگر ابراہیم علیہ السلام کے روبرو بھی یہ جواب دیا جاتا تو اس سے زیادہ تواضع نہ ہوتی۔ حالانکہ ابراہیم علیہ السلام نے جو بلایا تھا اُسکو ہزار سال گزر گئے اور وہی آواز ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے۔ پھر ہمارے نبی ﷺ کا زمانہ ولادت تو اسکے بہت بعد ہے اگر اس وقت خاص کا نقشہ ہماری آنکھوں میں کھینچ جائے تو کون سی تعجب کی بات ہے اور جس طرح ہم وقت معین میں لبیک کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اسی طرح وقت معین میں فداک ابی وامی یا رسول اللہ کہکر کھڑے ہو جائیں تو کونسی بُری بات ہوگی۔ اب رہی یہ بات کہ مولود شریف قرون ثلثہ میں نہیں تھا تو یہ بھی تسلیم نہیں اِس لئے کہ جتنی روایتیں مولود شریف میں پڑھے جاتے ہیں وہ

موضوع نہیں بلکہ کتب احادیث میں سب موجود اور صحابہ سے منقول ہیں ۔جس سے ثابت ہے کہ جتنی روایتیں مولود کی کتابوں میں پڑھی جاتی ہیں وہ سب صحابہ کے زمانہ میں پڑھے جاتے تھے البتہ نئی بات یہ ہے کہ میلاد شریف سے متعلق حدیثیں ایک جگہ جمع کردی گئیں مگر یہ بھی قابل اعتراض نہیں اسلئے کہ محدثین نے ابھی آخر ہر قسم کی حدیثوں کو علیحدہ علیحدہ کردیا ہے جو صحابہ نے نہیں کیا تھا پھر صحابہ وغیرہ ہم کا دستور تھا کہ جب کوئی واقعہ پیش نظر ہوتا تو اس سے متعلق جتنی حدیثیں یاد ہوتیں پڑھ دیتے اسی طرح میلاد مبارک کا واقعہ پیش نظر ہونے سے وہ سب روایتیں پڑھی جاتی ہیں اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولود شریف کا پڑھنا صحابہ کی سنت ہے۔اب اگر محل اعتراض ہے تو یہی ہے کہ میلاد شریف کی محفل قرون ثلثہ میں اس ہیئت پر نہ تھی، سواسکا جواب یہ ہے کہ اس محفل مبارک سے ایک بڑی مصلحت متعلق ہے وہ یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ اور دوسرے اقوام اپنے اپنے نبیوں کی پیدائش کے روز خوشیاں مناکر اپنی محبت کا ثبوت دیتے ہیں دور اندیش علماء نے یہ خیال کیا کہ بُعد زمانہ نبوی ﷺ مسلمانوں کی طبیعتوں میں بے باکی پیدا ہوگئی ہے ۔یہاں تک کہ نماز روزہ میں بھی لوگ قصور کرنے لگے جس سے دوسرے اقوام میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ اب

مسلمانی برائے نام رہ گئی ہے اور وہ رعب وداب، جو جانباز مسلمانوں کا اُنکے دل میں تھا کہ یہ لوگ اپنے نبی ﷺ کے حکم پر جان دینے کو مستعد ہیں، جانے لگا۔ اگر یہی خیال انکا ترقی پزیر ہوا اور مسلمانوں میں کوئی جوش اسلامی باقی نہ رہے تو چند روز میں بالکل بے وقعتی کی نگاہوں سے وہ دیکھے جائینگے اور معرض تلف میں ہو جائینگے۔ اسلئے یہ تدبیر نکالی کہ اپنے نبی ﷺ کی محبت کا جوش انکے دلوں میں پیدا کر دیا جائے چنانچہ مجالس وعظ میں عموماً ایسے مضامین بیان کرنے لگے جو باعث ازدیاد محبت ہوں مثلاً شفاعت کا مسئلہ اور صحابہ اور اولیاء اللہ کے فضائل اور حکایات اور معجزات اور فضائل نبی ﷺ زیادہ بیان کرنے لگے جن کے سننے سے اپنے نبی ﷺ کی عظمت ذہن نشین اور باعثِ ترقی محبت ہو۔ پھر محفل میلاد کی بنیاد ڈالی جس سے موافقین اور مخالفین کا امتیاز ہو جائے، کیونکہ مخالفین کو حضرت ﷺ کی پیدایش کی خوشی ہرگز نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اسکا سخت صدمہ انکے دلوں پر ہوتا ہے جس طرح خاص میلاد کے روز شیطان پر ہوا تھا غرضکہ اسکا اثر یہ ہوا کہ ہر فقیر و امیر بقدر حیثیت اِس محفل مبارک میں روپیہ صرف کرکے اسکا عملی ثبوت دیتا ہے کہ ہم اپنے نبی کریم ﷺ کے سچے دعا گو اور آپ کے وجود باجود سے خوش ہونیوالوں میں ہیں جس سے مخالفین پر یہ ثابت

ہو گیا کہ مسلمان اس بگڑی حالت میں بھی اپنے نبی ﷺ کے شیفتہ اور دل دادہ ہیں۔ نبض شناسان زمانہ خوب جانتے ہیں کہ یہ جوش محبت اسلامی کوئی معمولی بات نہیں بلکہ یہی جوش مخالفوں سے ان کو ممتاز اور علیحدہ کرنے والا ہے۔ اگر یہ جوش محبت بھی جاتا رہے تو اکثر مسلمانوں کی حالت گواہی دے گی کہ ان کو نہ احکام دینیہ سے تعلق ہے نہ اپنے نبی ﷺ سے محبت اور ظاہر ہے کہ اس بے تعلقی کا کیسا بُرا اثر مسلمانوں پر پڑے گا غرض قطع نظر فضیلت اور استحباب کے مولود شریف میں ایک ایسی مصلحت ملحوظ رکھی گئی جو دین و دنیا میں محمود و مطلوب ہے۔

دین میں اس وجہ سے کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ جب تک آدمی کو نبی ﷺ کی محبت اپنے ماں، باپ اور اولاد و مال سے بلکہ اپنی جان کی محبت سے زیادہ نہ ہو اسکا ایمان قابل شمار نہیں۔ اور دنیاوی مصلحت وہ جو مذکور ہوئی جس کو اسرار شناسان اسلام جانتے ہیں کہ موجد نے اس کو کیوں ایجاد کیا۔ کیا مصلحت وقت کا لحاظ رکھنے کی تعلیم نبی کریم ﷺ نے نہیں دی ہے؟ کیوں نہیں صدہا احادیث اس پر شاہد ہیں اسی کو دیکھ لیجئے کہ قبل ہجرت کس قسم کے احکام اور حالات تھے او بعد ہجرت قوت اسلام کے زمانہ میں کس درجہ پر پہونچے۔ اہل حدیث یہ بھی جانتے ہیں کہ آخری

زمانہ کے مسلمانوں کے لئے نبی کریم ﷺ نے کس قسم کی سہولتیں فرمائی ہیں ۔یہاں تک تو فرمادیا کہ دسویں حصہ پر بھی اگر وہ لوگ عمل کرلیں تو صحابہ کے برابران کوثواب ہوگا۔اب انصاف کی جائے کہ مصالح دینیہ و دنیویہ پرلحاظ رکھ کرمحفل میلاد شریف کی جائےتو کیاوہ باعث دخول دوزخ ہوگی ۔اوروہ ارشادنبوی ﷺ کہ اعمال کے حسن و قبح کا دارومدارنیت پر ہے اور خدائے تعالیٰ عمل کونہیں دیکھتا ہے ۔نیتوں کو دیکھتا ہے وغیرہ۔ احادیث معاذ اللہ بیکار ہوجائیگی ہرگزنہیں ۔غرضکہ اِس قابل تحسین نیت کے بعد ہمارا حسن ظن تو یہ ہے کہ یہ عمل باعث خوشنودی خدااور رسول ﷺ ہے۔اوریقین ہے کہ بمصداق انا عند ظن عبدی بی ۔ یہ ہمارا حسن ظن بیکار نہ جائے گا۔ہم اس کو مانتے ہیں کہ بعض علماء نے صرف حدیث کل بدعۃ ضلالۃ کوپیش نظر رکھ کراس مجلس متبرکہ میں کلام کیا ہے مگر آپ نے دیکھ لیا کہ جونکتہ رس ، دقیقہ شناس علماء تھے ۔مثل حافظ شیخ الاسلام ابن حجر عسقلانی اور امام سیوطی وغیرہ ۔ رحمہم اللہ انہوں نے اسکا جوازاستحباب ثابت کردیا۔غور کیجئے کہ وہ بھی آخر مقتدااور متبحر علما مانے جاتے ہیں۔جن کے اقوال استدلال میں پیش کئے جاتے ہیں ان کوگمراہ ومخالف اسلام قرار دینا کیونکر جائز ہوگا۔ایسے موقع میں توانکا احسان ماننا چاہئے کہ انہوں نے

علاوہ اور مصالح کے شرعی طور پر بھی اسکا استحباب ثابت کردیا۔

یہاں شاید ناواقفوں کو یہ خلجان نہ ہوگا کہ ایک ہی چیز حرام اور مستحب کیونکر ہوسکتی ہے۔ پھر کیا وجہ کہ مولود شریف کو ایک جماعت حرام اور ایک جماعت مستحب کہتی ہے۔

اس خلجان کو اسطرح دفع کیا جائے کہ جن علماء کی نظر محدود رہی کہ مولود شریف قرون ثلثہ میں نہ تھا وہ اسکی حرمت کے قائل ہوگئے اور جن کی نظر وسیع تھی وہ مصالح اور اغراض پر غور کرکے استحباب کے قائل ہوگئے۔

دیکھئے صرف ونحو کا علم نہ حضرت ﷺ کے زمانہ میں تھا نہ صحابہ کے زمانہ میں گو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے چند قاعدے بیان فرما کر اسکی بنیاد ڈالی مگر تدوین اسکی ایک مدت میں ہوئی اور نہ قال کی اصل قول ہونے پر کوئی شرعی دلیل قائم ہوسکتی ہے۔ مگر چونکہ قرآن وحدیث کا سمجھنا سمجھانا اِن علوم سے متعلق ہے اسلئے گو وہ بدعت ہیں مگر اُنکی تعلیم واجب قرار دی گئی اگر ہمارے دین سے ان علوم کو تعلق نہ ہوتا تو اِن کی حرمت پر ضرور فتویٰ دیا جاتا اِس سے ظاہر ہے کہ اغراض صیحہ کہ لحاظ سے کبھی وجوب بھی آجاتا ہے جسکو وجوب لغیرہ کہتے ہیں۔ پھر اگر مولود شریف میں باوجود بدعت ہونے کے استحباب آجائے تو کیا عجب غرضکہ علما جانتے ہیں کہ اغراض ،مصالح

اور جہات کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔

جو ضرورت اِس محفل مبارک کی ایجاد اور ابقاء میں علمائے متاخرین کے پیش نظر تھی اُسکا وجود قرون ثلثہ میں نہ تھا اسلئے اُس زمانے کے کل اہل اسلام وقتاً فوقتاً ہر ایک امر میں نبی ﷺ کی محبت کا عملی ثبوت دیتے تھے جسکا اثر یہ ہوا کہ اسلام شرقاً و غرباً انکی جانبازیوں سے پھیلا اُن کو ضرورت نہ تھی کہ سال میں ایک بار اپنی محبت کا اظہار کریں۔ بخلاف اِس زمانہ کے کہ کل اہل اسلام سال میں ایک بار بھی اگر اپنی سچی محبت اپنے نبی کریم ﷺ کی میلاد مبارک میں ظاہر کریں تو غنیمت ہے۔

قرون ثلثہ میں روز میلاد شریف کے عید مقرر نہ ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جو علامہ نجم الدین غیطیؒ نے کتاب التعریف بالمولد الشریف میں مولفہ علامہ شمس الدین ابن الجزریؒ سے نقل کیا ہے کہ جو روز میلاد شریف کا ہے وہی وصال شریف کا دن ہے۔

اسلئے سرور و غم برابر برابر ہو گئے انتہیٰ۔ اگر غور کیا جائے تو اُن شیفتگان جمال نبوی ﷺ پر وہ روز ایسی مصیبت اور ماتم کا تھا کہ جسکا بیان نہیں ہوسکتا جیسا کہ واقعات سے ظاہر ہے آنحضرت ﷺ کی بیماری میں صحابہ کی یہ حالت تھی کہ ہر مجلس ماتم کدہ سمجھی جاتی چنانچہ بخاری شریف میں ہے

کہ اُس زمانہ میں اتفاقاً صدیق اکبر اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کا گزر انصار کی مجلس پر ہوا دیکھا کہ سب زار زار رو رہے ہیں اُسکا سبب دریافت کیا اہل مجلس نے کہا کہ ہمیں حضرت نبی کریم ﷺ کی مجلسیں یاد آتی ہیں جن میں حضرت ﷺ کے ساتھ ہم لوگ بیٹھتے تھے اب قرائن سے معلوم ہورہا ہے کہ وہ دن آگئے کہ ہم لوگ اس دولت عظمیٰ اور فیضان مصاحبت سے محروم ہوجائیں ۔اُن شیفتگان دیدار نبوی ﷺ کی حالت کا اندازہ اِس روایت سے ہوسکتا ہے جو بخاری شریف میں ہے کہ ایک روز صبح کی نماز ہورہی تھی اور صدیق اکبر نماز پڑھارہے تھے کہ حضرت ﷺ نے حجرہ مبارک کا پردہ اس غرض سے اٹھایا کہ نماز کی حالت ملاحظہ فرمادیں پردہ اٹھنا ہی تھا کہ صدق اکبر اپنی جگہ سے ہٹ گئے اور مارے خوشی کے قریب تھا کہ نماز کو توڑ کر دیدار جاں بخش سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں مگر حضرت ﷺ کب گوارا کر سکتے تھے کہ عبادت الٰہی میں خلل واقع ہو فوراً یہ فرما کر پردہ چھوڑ دیا کہ نماز کو تمام کرلو۔ دیکھئے صحابہ حضور قلب وغیرہ لوازم وآداب نماز کو خوب جانتے تھے مگر غلبۂ شوق دیدار نے سب بھلا دیا اور ایک ایسی حالت طاری ہوئی جو مصداق اِس شعر کے تھی ؎

در نماز م خم ابر دے تو چوں یاد آمد حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

روز وصال ہر چند صدیق اکبر نے نہایت استقلال اور تکلف سے کام لیکر خطبہ پڑہا اور مسلمانوں کو تسلی دی مگر حالت یہ تھی کہ وہ بھی ضبط گریہ نہیں کر سکتے تھے۔اور بے اختیار کہتے تھے کہ یارسول اللہ ﷺ آپ کے انتقال سے وہ چیز منقطع ہوگئی جو کسی اور نبی علیہ السلام کی موت سے منقطع نہیں ہوئی تھی آپ کی نعت جس قدر کی جائے تھوڑی ہے اگر ہمارا بس چلتا تو ہم سب آپ پر سے اپنے کو فدا کر دیتے اور ایک مرثیہ پڑھا جسکا شعر یہ ہے ۔

یا لیتنی من قبل مهلك صاحبی غلیبت فی جدث علے صحوز

یعنے کاش میں اپنے صاحب کی وفات سے پہلے اپنی قبر میں مدفوں ہوتا اور مجھ پر پتھر ڈالے جاتے۔

عمر کو تو اُس صدمہ جانکاہ نے دیوانہ بنادیا تھا کچھ ایسے حرکات اُسوقت اُن سے صادر ہو رہے تھے کہ سب حضار ترساں ولرزاں تھے کسی کی مجال نہ تھی کہ اُن سے کچھ کہہ سکے جب کسی قدر افاقہ ہوا تو کہنے لگے یارسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں آپ پیشتر ،ستون کے پاس خطبہ پڑہا کرتے تھے جب منبر بنایا گیا اور آپ اُسپر خطبہ پڑھنے لگے تو ستون پر آپکے فراق کا اسقدر صدمہ ہوا کہ آدمی کی طرح زار زار روتا تھا تو آپکی امت کا کیا حال ہونا چاہئے۔

حضرت عثمان کی اُسوقت یہ حالت تھی کہ منہ سے بات نہیں نکل سکتی تھی۔حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر اِس قسم کا اتنا بار پڑا کہ باوجود اُس قوت وشجاعت کے آپ زمین پر بیٹھ گئے اور حس وحرکت دشوار ہوگئی۔

حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا پر اس صدمہ کا اثر اسقدر ممتد ہوا کہ جب تک آپ زندہ رہیں گویا جانتے ہی نہیں کہ ہنسی کیا ہے۔

بلال رضی اللہ عنہ جب اذان میں اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہتے تو مسجد میں کہرام مچ جاتا تھا۔

عبداللہ بن انیس کا انتقال ہی اِس صدمہ جاں ستاں سے ہوگیا۔

غرضکہ اس حادثہ جانکاہ سے کل صحابہ کی یہ حالت تھی کہ اُن پر زندگی وبال جان ہوگئی تھی۔اب غور کیجئے کہ جب دوازدہم شریف کا روز اُن پر اُن شیفتگان جمال نبی ﷺ اور سوختگان آتش فراق پر، آتا ہوگا،تو اُنکی کیا حالت ہوتی ہوگی۔کیا ایسی حالت میں کسی قسم کی خوشی دل میں راہ پاسکتی ہے ہرگز نہیں۔ایک مدت تک مسلمانوں کی تقریباً اسی قسم کی حالت رہی۔

متاخرین نے دیکھا کہ اب مسلمانوں کے دلوں پر عموماً وہ جوش محبت تو رہا ہی نہیں جو مقتضی غم وفات ہو،اور حضرت ﷺ کی وفات کے معنے تو صرف اسی قدر رہیں کہ اس عالم سے دوسرے عالم کو تشریف لے گئے، ورنہ حضرت

ﷺ کی زندگی میں کیا شک، اسلئے اُس غم کو جو عارضی تھا کالعدم کر کے اصلی مسرت اور خوشی کو جسکا اثر قیامت تک باقی ہے پیش نظر رکھا اور اُس روز کو خالص روز عید قرار دیا جس میں کل اہل اسلام بالاتفاق اپنی محبت اور گرم جوشیاں ظاہر کر کے اپنی محبت کا ثبوت دیں۔ چنانچہ اس قرارداد علما کو تقریباً کل اہل اسلام نے مان بھی لیا اور صورت اجماعی منعقد ہوگئی۔ اور بمصداق ماراہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن وہ قابل تحسین ہی ہوئے پھر اُن حضرات نے اِس سے بڑے بڑے فوائد بھی حاصل کیۓ چنانچہ نجم الدین غیطی نے اور ابن حجر مکی نے امام شمس الدین الجرزی کا قول نقل کیا کہ مولود شریف کی خاصیت یہ ہے کہ جس سال وہ محفل کی جاتی ہے اُس سال بلاؤں سے امن رہتا ہے اور یہ فقط اعتقادی بات ہی نہیں بلکہ اُس کا تجربہ بھی مکرر ہو چکا ہے۔ الحاصل محفل میلاد میں کئی مصلحتیں اُن حضرات کے پیش نظر تھیں اور مصالح کا لحاظ کرنا شرعاً محمود اور مسنون ہے۔ علامہ زرقانی نے شرح مواہب لدنیہ میں لکھا ہے کہ مدینہ طیبہ میں ایک منافق مرا اور آنحضرت ﷺ سے درخواست کی گئی کہ اپنا ملبوس خاص عنایت فرمادیں تاکہ برکت کے لئے اُسکے کفن میں وہ شامل کیا جائے حضرت ﷺ نے اپنا قمیص مبارک بدن سے اُتار کر عنایت فرمایا اور صحابہ کو اس

مصلحت پر مطلع فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ میرے قمیص سے کچھ فائدہ نہیں ہوسکتا اسلئے کہ وہ منافق ہے مگر مجھے امید ہے کہ اس رعایت خاص کی وجہ سے اُسکی قوم سے ہزار شخص مسلمان ہونگے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دیکھئے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیرہن مبارک جو اعلیٰ درجہ کا متبرک ہے منافق جو کافر سے بھی بدتر ہے اُسکے کفن کے لئے دینا ہرگز کسی مسلمان کی طبیعت گوارا نہیں کرسکتی مگر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمومی مصلحت کے لحاظ سے اُسکو گوارا فرمایا۔

چنانچہ بخاری شریف اور فتح الباری میں ہے کہ عمرؓ ایک روز خانہ کعبہ میں جا بیٹھے اور کہا میرا قصد یہ ہے کہ جس قدر سونا چاندی کعبہ شریف میں رکھا ہے سب مسلمانوں میں تقسیم کردوں ابو وائلؓ نے کہا کہ یہ آپ نہیں کرسکتے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر کو باوجود کہ آپ سے زیادہ مال کی احتیاج تھی مگر انہوں نے یہ خیال نہیں کیا، عمرؓ نے کہا کہ بیشک ان حضرات کی اقتدا مجھے بھی ضرور ہے۔

شیخ الاسلام نے لکھا ہے کہ کعبہ شریف کا خزانہ خرچ نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تعظیم الاسلام اور ترہیب اعداء اُس سے متعلق ہے اسلئے کہ خزانہ کعبہ شریف اُس زمانہ میں مشہور تھا اس سے مستفاد ہے کہ شوکت اسلام کے لئے اگر کوئی ایسا کام کیا جائے جو ضرورت سے زیادہ ہو اُسکی اجازت

ہے چنانچہ شیخ الاسلام نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ سونا چاندی کی قندیلیں کعبہ شریف اور مسجد نبوی میں لٹکانے کو تقی الدین سُبکی نے جائز لکھا ہے دیکھئے اس میں بھی صرف شوکت اسلام ملحوظ ہے ورنہ ضرورت تو معمولی چراغوں سے بھی رفع ہوسکتی تھی۔ اسی طرح فتح الباری میں یہ بھی لکھا ہے کہ کعبہ شریف کو جو دیباج کی کسوت پہنائی جاتی ہے اسکے جواز پر اجماع ہوگیا ہے اور لکھا ہے کہ قاضی زین الدین عبدالباسط نے بحسب حکم شاہی ایک ایسی بہتر کسوت خانہ کعبہ کے لئے تیار کی کہ اُسکی عمدگی بیان کرنے سے زبان قاصر ہے اور اُنکی تحسین اس فعل کی کرکے یہ دعائیں دیں کہ ’’بسط اللہ تعالیٰ فی رزقہ وعمرہ وجزاہ اللہ عن ذالک احسن المجازاۃ‘‘ دیکھئے اس میں بھی وہی شوکت اسلام ملحوظ ہے ورنہ اول تو گھر کو کسوت پہنانا کوئی ضروری بات نہیں اور اگر کسی قسم کی ضرورت ہے بھی تو بیش قیمت دیباج کی ضرورت نہیں جسکے جواز پر اجماع ہوگیا ہے۔ اور کسوت خانہ کعبہ تو حضرت ﷺ کے زمانہ میں موجود تھی۔ خلاصۃ الوفا باخبار دارالمصطفیٰ میں لکھا ہے کہ عثمانؓ نے مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر از سرنو نہایت تکلف سے کی چنانچہ دیواروں کے پتھروں میں نقش ونگار کیا گیا اور ستون کے پتھر بھی نقش پرکار تھے سقف ساج کا بنوایا گیا جو اُس زمانے کی

بیش قیمت لکڑی تھی اور ممبر شریف پر غلاف پہلے آپ ہی نے اوڑھایا دیکھئے یہ سب امور شوکت اسلام سے متعلق ہیں ورنہ یہی مسجد مقدس آنحضرت ﷺ کے زمانے سے اُسوقت تک نہایت سادی اور تکلف سے عاری تھے۔ نہ نقش نگار تھا نہ ممبر پر غلاف اوڑھایا جاتا تھا۔ یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ باوجودیکہ خانہ کعبہ اور ممبر شریف کا غلاف ہمیشہ صحابہ کے پیش نظر رہا کرتا تھا مگر کسی سے یہ اعتراض مروی نہیں کہ بے ضرورت کپڑا کیوں اوڑھایا جاتا ہے؟ کیا ان لکڑیوں اور گھر کو سردی ہوتی ہے جیسے ہمارے زمانہ کے بعض حضرات غلافوں کو دیکھ کر کہا کرتے ہیں۔

اب یہ دیکھا جائے کہ مولود شریف میں کیا کام ہوتے ہیں اور وہ شرعاً جائز ہیں یا نہیں بڑے کام یہ ہیں اظہار سرور۔ تعین وقت، قصائد نعتیہ کا پڑھنا، تقسیم شیرنی اور بخور کا جلانا وغیرہ۔ اظہار سرور کا حال سنئے کہ باوجودیکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ یعنے فرحت والوں کو حق تعالیٰ دوست نہیں رکھتا مگر فضل اور رحمت الٰہی پر فرحت کرنے کا حکم ہے جیسا کہ قرآن شریف میں ہے قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَبِرَحْمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا یعنے لوگوں سے کہدو کہ صرف اللہ کے فضل اور رحمت کی خوشی کیا کریں۔

مطلب اِن آیتوں کا یہ ہوا کہ اگر کوئی خوشی کرے تو صرف اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کی خوشی کرے۔ اب غور کیجئے کہ آنحضرت ﷺ کے قدوم میمنت لزوم سے اِس عالم کو عزت بخشا کیا بڑا فضل اور رحمت الٰہی ہے۔ اس سے بڑھ کر کیا ہو کہ آپ ہمہ تن فضل اور رحمت ہیں۔ چنانچہ انبہجتہ السویہ میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا نام فضل اللہ بھی ہے جس پر ابن وجیہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ حق تعالےٰ نے فرمایا ہے وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَا تَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ اِلَّا قَلِيْلًا یعنے اگر اس کا فضل اور اُس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم شیطان کی پیروی کرتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ فضل اللہ محمد ﷺ ہیں انتہیٰ اور اسی میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ﷺ کے اسماء یہ بھی ہیں۔ رحمۃ، رحمۃ الامہ۔ نبی الرحمۃ۔ رحمۃ العالمین۔ رحمۃ مہداۃ اور آیہء شریف وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ کو ذکر کر کے ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت نہ صرف مسلمانوں کے حق میں رحمت تھے بلکہ کفار کے حق میں بھی رحمت تھے اور یہ حدیث طبرانی اور حاکم سے نقل کی ہے قال رسول اللہ ﷺ انا رحمة مهداة یعنے میں اللہ کی رحمت ہوں جو تمہارے لئے ہدیہ بھیجی گئی ہے۔ اب کہئے کہ ایسے ہمہ تن فضل اور رحمت کے نزول کے روز کو ہم عید نہ قرار دیں تو ہم سے زیادہ

ناقدر شناس کون ہو کہ خدائے تعالیٰ کے ہدیہ کی بھی ہم نے کچھ قدر نہ کی حالانکہ فضل اور رحمت الٰہی پر خوشی کرنا ہمارا فرض ہے جو آیہء موصوفہ فبذلک فلیفرحوا سے ظاہر ہے۔

تعین وقت اس کا حل ابھی معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم عاشورہ خود بھی رکھا اور اُس کے فضائل بیان فرمائے اور اس روایت سے بھی ظاہر ہے جو بخاری شریف کی کتاب الایمان میں ہے کہ کسی یہودی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ کی کتاب یعنی قرآن شریف میں ایک آیت ہے کہ اگر وہ ہماری کتاب میں ہوتی تو ہم لوگ اُس کے نزول کے دن کو عید بناتے آپ نے فرمایا کونسی آیت ہے کہا اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا جس کا ترجمہ یہ ہے کہ آج کے روز میں نے تمہارے دین کو کامل کیا اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کیا اور تمہارے دین اسلام سے راضی ہوا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ آیت کس مقام پر اور کس روز نازل ہوئی کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم عرفات پر کھڑے تھے یعنے حج کے روز اور جمعہ کا دن تھا انتہٰی۔ شرح بخاری شریف میں شیخ الاسلام عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہودی کا سوال تھا کہ اُس آیت کی جلالت شان

مقتضی ہے کہ اُس کے نزول کا روز عید بنایا جاتا۔ اور جواب میں مقام اور وقت نزول بیان کیا گیا جس کو سوال سے کوئی تعلق نہیں حالانکہ جواب میں سوال کی مطابقت چاہئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اشارۃً جواب دیا کہ وہ دونوں روز ہمارے یہاں روز عید ہیں اور ترمذی اور طبرانی وغیرہ کی روایتوں میں یہ بتصریح موجود ہے کہ بحمد اللہ ہمارے یہاں وہ دونوں روز عید ہیں حاصل یہ کہ یہودی کا مقصود تھا کہ اُس نعمت عظمےٰ کا دن اس قابل تھا کہ عید قرار دیا جاتا جس میں ہمیشہ خوشی ہوا کرتی ہے اس لئے کہ عید عود سے ماخوذ ہے جس کے معنے مکرر ہونے کے ہیں چونکہ روز عید مکرر ہوا کرتا ہے اس لئے اُس کا نام عید رکھا گیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اُس کو تسلیم کر لیا چنانچہ اُس کے جواب میں کہا کہ ہمارے یہاں اُس نعمت کی دوہری عید منجانب اللہ مقرر ہے ورنہ صاف کہہ دیتے کہ یہ تم لوگوں کی حماقت ہے کہ ایک گزشتہ واقعہ پر ہر سال خوشیاں منایا کرتے ہو۔ اب غور کیجئے کہ جب یہ مسلم ہے کہ کسی نعمت عظمیٰ کے حصول کا دن اس قابل ہے کہ ہمیشہ اُس میں خوشی اور عید کی جائے تو بتائے کہ مسلمانوں کے نزدیک حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری اور نزول اجلاس سے بڑھ کر کونسی نعمت ہوسکتی ہے پھر اگر اُس روز خوشی نہ کی جائے تو کونسا دن آئے گا جس

میں ایمانی طریقہ سے خوشی کی جائے گی۔ اگر اُس آیۂ شریفہ کے نزول کے روز دوہری عید ہے۔ تو نزول اجلال سید المرسلین ﷺ کے روز یعنے میلاد مبارک کے روز اُس سے دوچند زیادہ خوشی اور عید ہونی چاہیے۔

قصائد نعتیہ کا پڑھنا، اہل حدیث (علمائے حدیث) جانتے ہیں کہ قصیدہ ''بانت سعاد'' جو نعت میں ہے خود آن حضرت ﷺ کے روبرو پڑھا گیا اور حضرت نے اُس کے صلہ میں چادر مبارک عطا فرمائی اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے ممبر رکھا جاتا تھا جس پر وہ اشعار نعتیہ پڑھتے تھے جس کا حال ہم نے انوار احمدی میں کسی قدر بسط سے لکھا ہے۔

تقسیم شیرنی۔ وہ اِطعام طَعام میں داخل ہے جس کی تعریف قرآن شریف میں مُصرّح ہے۔ کما قال تعالیٰ، وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ اس کے سوا بہت سی آیات واحادیث اُس کی فضیلت میں وارد ہیں جو محتاج بیان نہیں۔

بخور جلانا۔ ''خلاصۃ الوفا'' میں ابن ماجہ کی روایت مذکور ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ مسجدوں کو جمعہ کے روز بخور دیا کرو اور لکھا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک بخوردان آیا اُس کو آپ نے سعد رضی اللہ عنہ کے حوالہ کیا کہ اُس میں بخور جلا کر ہر جمعہ اور رمضان میں مسجد نبوی ﷺ کو بخور دیا

کریں۔ اور ایک شخص اسی کام پر مامور تھا کہ جمعہ کے دن بخور جلا کر ہر شخص کے پاس لیجائیں اور سب کو معطر کریں۔ غرضیکہ اَمـاکِن اور مقامات متبرکہ میں بخور کی خوشبو سے اہلِ جلسہ کو معطر کرنا مسنون ہے۔

قیام۔ اِس کا حال اوپر لکھا جاچکا ہے لیکن تکملۃً یہاں بھی لکھا جائے تو بے موقع نہ ہوگا۔ احادیث مذکورہ بالا سے ثابت ہے کہ تخیل پر اصل واقعہ کے آثار مرتب ہونا قطع نظر اس کے کہ امر طبعی ہے۔ شریعت میں بھی اس کے نظائر موجود ہیں جیسا کہ ابھی معلوم ہوا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے جب آیہء شریف وَابْیَضَّتْ عَیْنَاہُ پڑھی تو روتے روتے بے خود ہوگئے۔ اور آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقام تبوک میں اظہار خوف وخشیت کیا۔ اور ابراہیم اور اسمعیل علیہما السلام کی خوشی کا دن ہمیشہ کے لئے روز عید مقرر ہوا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی نجات کے روز آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شکریہ کا روزہ رکھا اور ترغیب امت کے لئے اُس کے فضائل بیان فرمائے۔ اور اپنی ولادت باسعادت کے روز یعنے روز دوشنبہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ روزہ رکھا کرتے تھے۔ اور ابولہب کو دوزخ میں پانی پینے کو ملا کرتا ہے خاص خاص واقعات کے آثار اُن کے خاص قسم کی تخیل پر مرتب ہوا کرتے ہیں۔ اس صورت میں اگر آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے تخیل پر مسلمانوں کے دل

میں فرحت پیدا ہوتو نہ شرعاً وہ مذموم ہے نہ یہ کہنا درست ہوگا کہ جو اصلی واقعہ پر آثار مرتب ہوتے ہیں تخیل پر مرتب کرنا درست نہیں۔ اس بنا پر جتنی حدیثیں اس باب میں وارد ہیں کہ فرحت کے وقت کھڑے ہو جانا درست بلکہ مسنون ہے سب ہمارے مفید مدعا ہو گئیں کیونکہ جب مسلمان میلاد شریف کے حالات سنتے ہیں تو اُن کو بے حد خوشی ہوتی ہے اس وجہ سے کہ حضرت ﷺ کا اس عالم میں تشریف فرما ہونا اُن کے لئے نجات اور فرحت ابدی کا باعث ہوا۔ کیا کوئی مسلمان ایمان کی راہ سے یہ کہہ سکتا ہے کہ نجات و مسرت ابدی سے زیادہ کوئی نعمت ہرگز نہیں پھر جب کم درجہ کی فرحتوں میں قیام جائز اور مسنون ہو تو اس اعلیٰ درجہ کی فرحت میں قیام کی کس قدر ضرورت ہوگی۔

اب اُن روایتوں کو سنئے جن سے فرحت کے وقت قیام کا مسنون ہونا ثابت ہے۔ فتح الباری میں شیخ الاسلامؒ نے لکھا ہے کہ فتح مکہ کے روز عکرمہ یمن کی طرف بھاگ گئے تھے اُنکی بی بی نے اُنہیں مسلمان کر کے جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر کیا تو حضرت ﷺ اُن کو دیکھتے ہی کمال خوشی سے کھڑے ہو گئے اسی قسم کی اور روایتیں بھی ذکر کیں جن میں حضرت جعفر اور زید بن حارثہؓ کے قدوم کے وقت اور حضرت فاطمہ

رضی اللہ عنہا کو دیکھ کر قیام کرنا آنخضرت ﷺ کا مذکور ہے۔

بخاری شریف میں یہ روایت ہے ابصر النبی ﷺ و سلّم نساءً وصبیانًا مقبلین من عرس فقام ممتنًا فقال اللھم انتم من احب الناس الیّ یعنے آنخضرت ﷺ نے چند عورتوں اور لڑکوں کو دیکھا کہ کسی کے نکاح سے چلے آرہے ہیں فوراً کھڑے ہوگئے اور فرمایا خدا جانتا ہے تم لوگ سب سے زیادہ میرے محبوب ہو۔ شیخ الاسلام نے قام ممتنا کی شرح میں لکھا ہے کہ قام اللھم مسرعًا منتدافی ذلک فرحابھم یعنے کمال فرحت کی وجہ سے نہایت جلدی سے کھڑے ہوگئے اس روایت سے ظاہر ہے کہ یہ قیام معانقہ وغیرہ کے لئے نہیں تھا۔ اس لئے کہ عورتوں اور لڑکوں سے معانقہ درست نہیں بلکہ مقصود اُس سے صرف اظہار فرحت تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ قدوم احباب کے وقت جو آنخضرت ﷺ قیام فرمایا کرتے تھے اس کی وجہ بھی اظہار فرحت ہی ہوا کرتی تھی تو اب مسلمانوں کو چاہئے کہ جس وقت میلاد شریف سنیں اور اُس میں سید کونین ﷺ کا اس عالم میں تشریف فرمانا پیش نظر ہوجائے جو اعلیٰ درجہ کی فرحت کا باعث ہے تو اُس وقت ان احادیث کو اپنا پیشوا اور مقتدا بنا کر خوشی سے کھڑے ہوجایا کریں اور بدعت اور شبہ فی العبادت

وغیرہ شبہات کو ان روایات سے دفع کردیا کریں۔ یہی امور گویا محفل میلاد کے ذاتیات ہیں اور آپ نے دیکھ لیا کہ وہ فرادیٰ مسنون یا مستحب تو ضرور ہیں۔ رہے امور خارجیہ جیسے عورتوں کا مولود شریف ایسے طور پر پڑھنا کہ اجنبی لوگ اُن کی آوازیں سنیں یا نشہ کی حالت میں پڑھنا۔ یا اور کسی قسم کی بے ادبی پڑھنے کے وقت کرنی جو شرعاً ممنوع ہو وہ ضرور اس قابل ہیں کہ موقوف کردیئے جائیں جیسے کل عبادات میں یہی حکم ہے۔ مثلاً نماز لوگوں کو بتلانے کی غرض سے پڑھنی جس سے احتراز کی ضرورت ہے مگر ایسے امور سے نماز یا مولود شریف کے جواز میں کلام نہیں ہوسکتا۔ رہی بات اجتماعی امور مذکورہ کی سو اُس کا بھی جواز بلکہ استحباب بتصریح علما سے ثابت ہوگیا اور قطع نظر اُس کے اس قسم کے بدعتوں کی ایجاد کی شرعاً اجازت ہے جیسا کہ حدیث صحیح من سنۃ حسنۃ الحدیث سے ظاہر ہے جسکا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کوئی اچھا کام ایجاد کرے اُس کو ثواب اُس کا اور اُس پر عمل کرنے والوں کا ملے گا۔ اور جو برا کام ایجاد کرے اُس کا اور اُس پر عمل کرنے والوں کا گناہ اُس پر ہوگا۔

دیکھئے قرون ثلثہ کی یا اور کسی بات کی تخصیص نہیں بلکہ عام ارشاد ہے کہ جو کوئی اچھا طریقہ ایجاد کرے اگر اس کی تخصیص قرون ثلثہ کی ساتھ کردی

جائے تو بدعتیوں کو بڑی مدد مل جائے گی وہ یہ کہیں گے کہ جس طرح اچھے کاموں کی وہی ایجاد باعث ثواب ہے جو قرون ثلثہ میں ہو اسی طرح برے کاموں کی بھی وہی ایجاد باعث عذاب ہوگی۔ جو قرون ثلثہ میں ہو اس لئے بدلیل مقابلہ دونوں شقوں میں تعمیم یا تخصیص ایک ہی قسم کی معتبر ہوگی اور اُس صورت میں مطلب حدیث شریف یہ ہوگا کہ جتنے برے کام قرون ثلثہ کے بعد ایجاد کئے جائیں وہ قابل مواخذہ نہیں حالانکہ یہ غلط ہے اِس سے ثابت ہے کہ بُرے کاموں کی ایجاد جس طرح ہر زمانہ میں مذموم ہے اچھے کاموں کی ایجاد بھی ہر زمانہ میں محمود ہے۔ الحاصل اگر مولود شریف بدعت بھی ہو تو بدعت حسنہ ہے جس کی اجازت شریعت میں وارد ہے۔ رزقانی نے شرح مواہب لدنیہ میں لکھا ہے کہ تاج فاکہانی نے مولود شریف کو بدعت مذمومہ لکھا ہے مگر امام سیوطی نے ان کے استدلال اور تقریر کو حرفاً حرفاً رد کیا۔ **جزاہ اللہ عنا خیر الجزاء**

ہمیں یقین ہے کہ ہمارے بعض معاصرین اس رسالہ کی چند حدیثوں کو درایت کے شکنجہ میں ضرور کھینچیں گے مگر چونکہ اس میں ہمارے ہم مشربوں کی طرف ہمارا روئے سخن ہے اس لئے اُن کے شبہات کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔ اس پر بھی اگر شوق ہو تو ہم نے کتاب العقل اور حقیقۃ الفقہ اور

افادۃ الافہام وغیرہ میں بحث درایت تفصیل سے لکھی ہے اُن میں ملاحظہ فرمائیں امید ہے کہ اہل انصاف کو اُسے سے تسکین ہو جائے گی۔

تحقیق الایمان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدلله رب العالمین و الصلواة و السلام علی سیدنا محمد و اله و اصحابه اجمعین.

اما بعد اضعف العباد محمد انوار اللہ عفی عنہ اہل اسلام کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ مسئلہ ایمان ایک مہتم بالشان مسئلہ ہے جس کے معلوم کرنے کی ضرورت ہر ایمان دار کو ہے بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ رسمی ایمان کو حقیقی ایمان سمجھ لیتے ہیں چنانچہ چند بدوں نے دعوے سے کہا تھا کہ ہم ایمان لائے ۔مگر خود اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ اُن سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے اور ہنوز دل میں تمہارے ایمان نہیں داخل ہوا یہ کہو کہ ہم منقاد و فرماں بردار ہو گئے ہیں جیسا کہ اس آیۂ شریف میں ہے۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلُ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ اور دوسری آیت میں ارشاد ہے۔ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ

آمَنُوا آمِنُوا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتَابِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتَابِ الَّذِیْ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ یَکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِیْدًا ۔اے مسلمانو! اللہ پر ایمان لاؤ اور اُسکے رسول پر اور اُس کتاب پر جو اُس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتاری ہے اور اُن کتابوں پر جو پہلے اتاریں اور جو شخص اللہ کا منکر ہو اور اُس کے فرشتوں کا اور اُس کی کتابوں کا اور اُس کے رسولوں کا اور روز آخرت کا تو بڑی دور بھٹک گیا۔ کوئی بات تو ہوگی جو حق تعالیٰ اہل ایمان کو مخاطب کر کے ایمان لانے کا حکم فرماتا ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ جو خود ایمان دار ہوں اُن کا ایمان لانا تحصیل حاصل ہے جو محال ہے۔ اس بات پر ہر شخص کا وجدان گواہی دے گا کہ آدمی جب کوئی خبر سنتا ہے تو اُس کے دل میں ایک قسم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو اُس خبر کے صدق سے متعلق ہے۔ ہر چند مدارج اُس کے بے انتہا ہوسکتے ہیں ۔ مگر علماء نے اُس کے چار درجے قرار دیئے ہیں وہم، شک، ظن اور یقین ۔ پہلا درجہ وہم ہے جس میں اُس خبر کے صدق کا احتمال مرجوح اور عدم صدق کا احتمال راجح ہو۔ مثلاً اخباروں میں جب یہ خبر شایع ہوئی کہ سوائے تار برقی کے ایک آلہ ایسا ایجاد ہوا ہے کہ اُسکے ذریعہ سے بغیر تعلق تار وغیرہ کے دور دور کی

خبریں معلوم ہوتی ہیں۔ اگرچہ اِس لحاظ سے کہ آج کل اقسام کی ایجادیں ہورہی ہیں اس خبر کے صدق کا احتمال تو ہوگیا مگراس لحاظ سے (کہ بغیر تعلق کے دور دور کی خبریں معلوم ہونا خلاف عقل ہے)ظن غالب اور احتمال راجح یہی تھا کہ جھوٹ ہوگی۔ غرضکہ اِس مثال میں صدق کی جانب مرجوح اور عدم صدق کی جانب راجح ہے اس لئے کہا جائے گا کہ یہاں صدق کا وہم اور عدم صدق کا ظن ہے۔ اور اگر دونوں جانب برابر ہوجائیں ۔مثلاً دو چار آدمی کہہ دیں کہ ہم نے بچشم خود وہ آلہ دیکھا ہے۔ اور اُس کے ذریعہ سے خبریں دریافت کی ہیں اور وہ خبریں صحیح ثابت ہوئیں جس سے صدق کی جانب کوقوت ہوجائے مگر نہ اس قدر کہ احتمال کذب پر اُس کا غلبہ ہو بلکہ دونوں احتمال برابر ہوں تو اُس کو شک اور تردد کہتے ہیں۔ پھر اگر اور چند لوگ گواہی دیں جس کی وجہ سے صدق کا احتمال غالب اور کذب کا احتمال مغلوب ہوجائے تو کہا جائے گا کہ اُس خبر کے صدق کا ظن اور کذب کا وہم ہے۔ پھر اگر اُس خبر کی صحت پر اتنی گواہیاں پہونچیں کہ اُن کی تکذیب نہ ہوسکے اور احتمال کذب باقی نہ رہے تو اُسکو یقین کہیں گے اس سے ظاہر ہے کہ یقین اُس کیفیت قلبی کا نام ہے کہ جس میں کسی قسم کا تردد نہ ہو مثلاً اگر کوئی کہے کہ آفتاب روشن ہے۔تو ہمارے

وجدان میں ایک ایسی کیفیت پائی جائے گی جو اُس خبر کی جانب مقابل یعنی روشن نہ ہونے کا خیال بھی نہ آئے گا اور اگر اس قسم کی کیفیت پیدا نہ ہو تو اُس کو یقین نہ کہیں گے۔

اِن چاروں کیفیتوں پر جو آثار مرتب ہوا کرتے ہیں اُنکے مدارج مختلف ہیں۔ مثلاً کسی مسافر سے جنگل میں ایک شخص کہہ دے کہ اِس راہ میں شیر ہے اور کہنے والا معمولی آدمی ہو تو اُس سے صرف وہم پیدا ہوگا جس کے اثر سے ابتدائی درجہ کا خوف پیدا ہوگا جو اِس خبر کے سننے سے پہلے نہ تھا۔ پھر اگر کسی قرینہ یا دوسرے شخص کے خبر دینے سے اُس احتمال میں قوت پیدا ہوا اور شک کی نوبت پہنچ جائے تو خوف بہ نسبت سابق کے زیادہ ہوگا اور کسی قدر احتیاط کی ضرورت معلوم ہوگی پھر اگر دوسرے قرائن یا اخبار سے ظن غالب ہو جائے تو بہ نسبت سابق کے خوف اور زیادہ ہوگا اور مزید احتیاط کی ضرورت داعی ہوگی اور جب متواتر خبروں اور مختلف قرائن سے یقین ہو جائے کہ بیشک شیر اُس راہ میں موجود ہے تو انتہائی درجہ کا خوف طاری ہوگا۔ یہاں تک کہ اُس راستہ ہی کو چھوڑ دے گا اور اگر اپنی شجاعت پر پورا بھروسہ ہو تو ایسے ہتھیار ساتھ لے گا کہ جن سے کامیابی کا یقین ہو غرضکہ کیفیات قلبیہ وجدانی امور ہیں ہر شخص اپنے وجدان سے ان

کا فیصلہ کرسکتا ہے کہ کس قسم کی کیفیت کا وجود ہے۔ جس پر آثار جو ہر کیفیت کے جدا جدا ہوتے ہیں۔ بمنزلہ گواہوں کے۔ مقصود اِس تقریر سے یہ ہے کہ جو خبریں قرآن اور احادیث میں وارد ہیں خواہ خدا کی ذات و صفات سے متعلق ہوں یا فرشتوں اور امم سابقہ اور ہمارے نبی کریم ﷺ سے۔ اور واقعات آئندہ وغیرہ سے مسلمان کو چاہئے کہ اُن سب پر ایمان لائے اور غور کرے کہ چوتھے درجہ کی کیفیت یعنی یقین کا وجدان ہے یا نہیں اگر ہو تو شکر الٰہی بجالائے۔ مگر اُس کے ساتھ یہ بھی دیکھ لے کہ اُس یقین کے آثار ولوازم بھی پائے جاتے ہیں یا نہیں مثلاً جب اُس کا یقین ہو کہ خدائے تعالیٰ علیم اور سمیع و بصیر ہے تو اُس کا اثر یہ ہونا چاہئے کہ خدائے تعالیٰ کے خلاف مرضی کوئی کام نہ کرے۔ کیونکہ اُس یقین کا لازمہ یہ ہے کہ خوف الٰہی پیدا ہو پھر مقتضیٰ اُس خوف کا یہ ہے کہ اگر کوئی گناہ غفلت سے صادر ہو جائے تو دل میں ندامت پیدا ہو اور بصدق دل توبہ کرے۔ اگر اس قسم کے آثار پیدا نہ ہوں تو اس لحاظ سے کہ ''اذا ثبت الشیء ثبت بلوازمہ''۔ اور بحسب قاعدۂ معقول انتفائے لازم سے انتفائے ملزوم سمجھا جاتا ہے۔ اُس یقین میں کلام ہوگا۔

اب ایمان کے معنی سنئے کہ علمائےؒ نے کیا لکھا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ لفظ

ایمان امن سے ماخوذ ہے جسکے معنی باب افعال میں لے جانے سے امن دینے کے ہوئے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے ’’ وَآمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ‘‘۔ یعنی اُن کوخوف سے امن دیا۔لسان العرب میں لکھا ہے کہ ’’ آمَنْتُ فا نا امن و امنتُ غیری من الامن والامان ‘‘اوراگرلفظ ایمان تصدیق کے معنی میں ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ کا نام مبارک مومن ہے اسکی وجہ بعضوں نے لکھی ہے کہ قیامت کے روز اہل ایمان کوامن دے گا اور بعضوں کا قول ہے کہ اُنکی تصدیق فرمادے گا۔انتہیٰ ملخصاً۔ بیضاوی شریف میں ہے کہ ایمان لغت میں تصدیق کو کہتے ہیں ۔چنانچہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے والد سے کہا تھا۔’’وَمَا اَنْتَ بِمُوْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ کُنَّا صَادِقِیْنَ ‘‘یعنی آپ ہماری تصدیق نہ کروگے اگرچہ ہم صادق ہوں۔ دراصل ایمان بمعنی تصدیق بھی امن ہی سے ماخوذ ہے اس لئے کہ باب افعال میں لیجانے سے اُس کے معنی امن دینے کے ہوئے۔اورظاہر ہے کہ جوکوئی کسی کی تصدیق کرتا ہے گویا اُسکوتکذیب اورمخالفت سے امن دیتاہےاور بے فکر کردیتا ہے۔کذافی الکشاف وغیرہ۔چونکہ تصدیق ملزوم اورامن دینا لازم ہے۔اِس وجہ سے لفظ ایمان کا استعمال تصدیق کے معنی میں مجاز ہوگا ازقسم ذکرلازم وارادۂ ملزوم۔لیکن اس صورت میں چاہئے تھا

کہ متعدی بنفسہ ہونا اور ’’آمنتہُ‘‘ کہا جانا حالانکہ حرف با کے ساتھ وہ متعدی ہوا کرتا ہے اور امنت بہ کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ بیضاوی شریف وغیرہ میں یہ لکھی ہے کہ معنے اعتراف اقرار کی یہاں تضمین ہے اسلئے کہ جب کسی چیز کی تصدیق کی جاتی ہے تو اُس کا اعتراف اور اقرار بھی ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں آمنت باللہ کے معنی یہ ہوئے کہ میں اللہ تعالےٰ کے وجود کی تصدیق اور اعتراف کرتا ہوں اِس صلہ یعنی حرف با کے التزام سے یہ اہتمام مقصود ہے کہ مومن بہ کی تصدیق قلبی کے ساتھ اعتراف لسانی بھی ہو۔ علامہ شرنبلالی نے مراقی الفلاح میں اور کمال ابن ابی الشریف نے مسائرہ شرح مسامرہ میں لکھا ہے۔ کہ امن با (ب) کے ساتھ متعدی ہو تو اعتراف واقرار کی تضمین ہوگی جیسے ’’آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْهِ‘‘ اور لام کے ساتھ متعدی ہو تو اذعان وقبل کی تضمین ہوگی کما قال تعالیٰ وَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ شرح مقاصد میں لکھا ہے کہ ایمان کے معنے کا ماحصل صدق سمجھنا اور اُس چیز کا اعتراف کرنا ہے جسکی تصدیق کی جاتی ہے اور صادق متکلم کو بھی کہتے ہیں اور کلام کو بھی۔ اسلئے ہر چیز کی تصدیق مختلف اعتبارات سے ہوگی مثلاً ’’ آمَنْتُ بِاللّٰهِ ‘‘ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور اُن صفات کے متصف ہے۔ جو اُس کے لائق ہیں۔ اور

آمنت بالرسول کا یہ مطلب ہے کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔اور جو کچھ لائے ہیں اس میں وہ صادق ہیں ۔اور ’’آمنت بالملائکۃ‘‘ کا یہ مطلب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور گناہوں سے معصوم ہیں اور’’آمنت بکتبہ ‘‘ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے سچے کلام ہیں جو پیغمبروں پر نازل ہوئے ہیں ۔اور آمنت بالیوم الآخر کا یہ مطلب ہے کہ وہ دن ضرور آنے والا ہے۔اور اُس میں حساب و کتاب اور جزا وسزا ضرور ہوگی۔اور آمنت بالقدر کا یہ مطلب ہے کہ خیر وشر سب تقدیر اور مشیت سے ہے۔انتہی ملخصاً۔علامہ تفتازانیؒ نے تہذیب الکلام میں یہ لکھا ہے کہ ایمان لغت میں بمعنی تصدیق واذعان وقبول ہے جسکو فارسی میں گرویدن کہتے ہیں۔انتہی ملخصاً۔اذعان کے معنی گردن نہادن ہیں چونکہ ایمان کے معنی میں اذعان معتبر ہے اِس سے لازم ہوگیا کہ جس چیز پر ایمان لایا جائے اُس سے سرتابی نہ ہو اور یقینی طور پر قبول کرلیا جائے کہ وہ بات واقعی ہے اور اگر اُس سے ذرا بھی انحراف ہو تو ایمان کا مضمون صادق نہ آئے گا غرضکہ جو مسائل نصوص قطعیہ سے ثابت ہیں اُن میں یقین کی ضرورت ہے اسی وجہ سے معمولی ایمان والوں کو حکم ہے کہ ایمان لائیں یعنی ایسا یقین کریں کہ اُس پر آثار مرتب ہوں ’’کما قال تعالےٰ

یـاایُّھَاالَّذِیْنَ آمَنوُ اآمِنوُ ابِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتَابِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ ‘‘ الایۃ ۔ یہاں یہ بات بھی معلوم کرنے کے لائق ہے کہ ایمان کا ضد اور مقابل کفر ہے اور جس طرح ایمان کا صلہ با کے ساتھ آتا ہے کفر کا صلہ بھی با کے ساتھ آتا ہے اور جس طرح متعلق ایمان جو مدخول با ہے بحسب مناسب مقام مختلف ہوتا ہے متعلق کفر بھی مختلف ہوتا ہے مثلاً کفر باللہ کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے اللہ تعالےٰ کی توحید کو یا اُس کے صفات کو نہ مانا اور کفر بالرسول کا یہ مطلب ہے کہ اُن کو خدا کے بھیجے ہوئے نہ سمجھا یا اُنکی رسالت یا اُس چیز کو نہ مانا جو اللہ کی طرف سے پہنچا رہے ہیں ۔علی ھذا القیاس کفر بالاحکام کا یہ مطلب ہے کہ اُن کو من جانب اللہ اور مامور بہا نہ سمجھا۔مگر اس مقام میں ایک اشکال ہے وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے ’’ومن یکفر بالایمان فقد حبط عملہ وھو فی الاخرۃ من الخاسرین۔‘‘ ترجمہ: اور جو کوئی منکر ہوا ایمان سے اُس کے اعمال ضائع ہوئے اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں ہے ۔اِس آیۂ شریفہ میں مدخول با ایمان ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ کفر بالایمان باعث حبط اعمال ہے اور وہ درست نہیں اِس لئے کہ اگر کفر بالایمان حرام ہو تو ایمان بالایمان واجب اور باعث نجات ہوگا حالانکہ ایمان پر ایمان لانا کوئی بات نہیں جیسا کہ امام

رازیؒ نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے۔ ’’قولہ ومن کفر بالایمان فیہ اشکال وھوان الکفر انما یعقل باللہ ورسولہ فاما الکفر بالایمان فھو محال فلھذا السبب اختلف المفسر ون علیٰ وجوہ‘‘ یعنی کفر باللہ و بالرسول تو سمجھ میں آتا ہے لیکن کفر بالایمان محال ہے اسی وجہ سے مفسرین نے اسکے معنی میں اختلاف کیا ہے ۔پھر امامؒ نے مفسروں کے تین قول بیان کئے جو تینوں قول میں ایمان کے مجازی معنیٰ لئے گئے ہیں ہر چند بات یہی ہے جو امامؒ نے لکھی ہے مگر ایک توجیہ ایسی بھی ہوسکتی ہے جس میں ایمان کے معنیٰ مجازی لینے کی ضرورت نہیں ہوتی وہ یہ ہے کہ نفس ایمان پر بھی ایمان لانے کی ضرورت ہے اور اُس کا یہ مطلب ہوگا کہ یقین کرے کہ خدا اور رسول اور جمیع احکام وغیرہ پر ایمان لانا مامور بہ ہے کیونکہ ابھی معلوم ہوا کہ متعلق ایمان کے معنی مناسبت اور ضرورت لئے جاتے ہیں اُسکی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے نماز پر ایمان لانے کی ضرورت کہ وہ مامور بہ ہے جس کو خدائے تعالیٰ نے فرض کیا ہے۔اس ایمان کے وقت ضرور نہیں کہ خارج میں کوئی ایسی چیز ہو جس کو نماز کہیں بلکہ یہ کافی ہے کہ ذہن میں اُن حرکات وسکنات کا مجموعہ رہے جن پر نماز صادق آتی ہے اور یہ تصدیق کیجائے کہ مامور بہ ہے یعنی خدائے تعالیٰ نے اوقات مخصوصہ میں ایسے حرکات وسکنات کے بجالانے

کا حکم فرمایا ہے اسی طرح ایمان میں جن جن چیزوں کی ضرورت ہے مثلاً اذعان وتصدیق وغیرہ جن کا حال ان شاء اللہ تعالیٰ ابھی معلوم ہوگا اُن سب کے مجموعہ کا تصور کر کے یقین کیا جائے کہ وہ مامور بہ ہے اُس مجموعہ میں کل تفصیلی تصدیقات اور اُنکے متعلقات کا اجمالی طور پر تصور ہوگا کہ جن چیزوں کی خبر خدائے تعالیٰ نے دی ہے یا حکم فرمایا ہے خواہ وہ مطابق عقل ہوں یا نہ ہوں سب کی تصدیق ضروری ہے پھر اُس مجموعہ میں تصدیق کا بھی تصور ہوگا کہ وہ معمولی تصدیق نہیں بلکہ ایسی ہونی چاہئے کہ شک وشبہ کا اُس میں دخل ہی نہ ہو غرضکہ تفصیلی تصدیقوں میں جو امور ضروری ہیں وہ سب اس مجموعہ تصوری میں داخل ہوں اور اُس پر یہ حکم لگا یا جائے کہ اِس قسم کا ایمان مامور بہ ہے بخلاف اسکے اگر کہا جائے کہ خدائے تعالیٰ کا پورا کلام ماننے کی ضرورت نہیں صرف عقل کے مطابق جس قدر ہوں وہ مان لیا جائے اور خلاف عقل باتیں جیسے ابابیل کا ایک لشکر کو ہلاک کرنا اور موسیٰ علیہ السلام کے لئے دریا کا شق ہوجانا وغیرہ خوارق عادات جو قرآن شریف میں مذکور ہیں اُنکے ماننے کی ضرورت نہیں جیسا کہ فی زمانہ بعضے لوگ کہا کرتے ہیں سو یہی کفر بالایمان ہے جسکی وعید اس آیۂ شریف سے معلوم ہوتی ہے۔ ’’ومن یکفر بالایمان فقد حبط عملہ‘‘ ایمان کو مومن بہ قرار

دینے کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ وہ مامور بہ ہے۔'' کما قال اللہ تعالیٰ قل یا اھل الکتاب آمنو اور یاایھاالذین امنوا امنو '' وغیرہ اس سے ثابت ہے کہ ایمان مامور بہ ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس چیز کا حکم خدائے تعالیٰ نے کیا ہو اُس پر ایمان لانے کی ضرورت ہے۔ دیکھ لیجئے نماز وروزہ ، حج ، زکوٰۃ وغیرہ احکام پر جب تک یہ ایمان نہ ہو کہ وہ احکام الٰہی ہیں اور ان پر عمل کرنے کی ضرورت ہے تو ایمان ہی کیا ہوا۔ الحاصل پہلے مجملاً یہ ایمان لانا اور یقین کرنا ضرور ہے کہ کل قرآن پر ایمان لانے کا ہمیں حکم ہے خواہ وہ موافق عقل ہو یا مخالف اور اگر اُس کا انکار ہو تو من یکفر بالایما ن صادق آجائے گا۔'' ھذاماسخ لی واللہ اعلم بالصواب''۔

یہ تو ایمان کے معنے تھے۔ اب اُس کے مصداق کا حال بھی معلوم کر لیجئے۔ عمدۃ القاری شرح بخاری میں علامہ عینیؒ نے اور تفسیر کبیر میں امام فخر الدینؒ نے لکھا ہے کہ اہل قبلہ ایمان کے مسئلہ میں چار فرقے ہو گئے ہیں ایک فرقہ کا قول ہے کہ ایمان صرف فعل قلبی کا نام ہے۔ پھر اِس میں بھی دو مذہب ہیں ایک مذہب محققین جسکو امام اشعری اور اکثر آئمہ نے اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں

جسکا علم بالضرورۃ ہوگیا ہے اُس کی تصدیق جازم کا نام ایمان ہے خواہ دلیل سے وہ تصدیق حاصل ہو یا بغیر دلیل۔ علم ضروری کی قید اِس غرض سے لگائی گئی کہ جو اجتہادی مسائل ہیں۔ مثلاً یہ مسئلہ کہ خدائے تعالےٰ بذاتہ عالم ہے یا بعلم سوا ایسے مسائل مسمائے ایمان میں داخل نہیں البتہ اِس امر کی تصدیق ضروری ہے کہ خدائے تعالےٰ ہر چیز کو جانتا ہے کیونکہ اِس کا ذکر صراحۃً قرآن وحدیث میں وارد ہے اور تصدیق جازم کی قید اِس غرض سے لگائی گئی کہ تصدیق ظنی ایمان میں کافی نہیں ہوسکتی ہے بلکہ یقین کامل ہونا چاہئے کہ جو کچھ نبی ﷺ لائے ہیں اُس میں ذرا بھی شک نہ ہو۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ ایمان صرف معرفت قلبی کا نام ہے اُس میں اقرار کی ضرورت نہیں۔ یہاں تک کہ بعد معرفت الٰہی اگر کوئی شخص زبان سے انکار بھی کرے اور قبل انکار مرجائے وہ بھی کامل الایمان ہے یہ قول جہم بن صفوان کا ہے۔

دوسرے فرقہ کا قول ہے کہ ایمان عمل زبان کا نام ہے اس میں بھی دو مذہب ہیں غیلان دمشقی اور فضیل رقاشی کا مذہب یہ ہے کہ اقرار زبانی کے ساتھ معرفت قلبی شرط ہے اور کرامیہ کہتے ہیں کہ اُس کی ضرورت نہیں مگر منافق کی نسبت اُن کا قول ہے کہ وہ باعتبار ظاہر کے مومن اور باطن

میں کافر ہے اِسلئے دنیا میں مومنوں کے احکام اُس پر جاری ہونگے اور آخرت میں کافروں کے۔

تیسرے فرقہ کا قول ہے کہ ایمان عمل قلب ولسان کے مجموعہ کا نام ہے پھر اِس میں یہ اختلاف ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور عامہ فقہا اور بعض متکلمین کہتے ہیں کہ ایمان اقرار اور معرفت کی توجیہ اکثر نے یہ کی ہے اور وہی اصح ہے کہ وہ اعتقاد جازم ہے خواہ تقلیدی ہو یا دلائل سے حاصل ہو اور بعضوں کا قول ہے کہ وہ معرفت معتبر ہے جو دلائل سے حاصل ہو اِس قول پر مقلد کا ایمان صحیح نہیں ہوسکتا۔

اور اقرار لسانی جو ایمان میں معتبر ہے اُس کی ضرورت ایمان استدلالی میں ہے ورنہ ”فیما بینه و بین الله“ تصدیق کافی ہے اور بشر مروی اور ابوالحسن اشعریؒ کا قول ہے کہ وہ تصدق کہ وہ تصدیق بالقلب و باللسان ہے اور ایک جماعت صوفیہ کا قول ہے کہ وہ اقرار باللسان اور اخلاص القلب ہے۔ پھر بعضوں نے اقرار باللسان کو شرط قرار دیا ہے یعنی اصل ایمان سے وہ خارج ہے اسی وجہ سے جو شخص ماجاربہ النبی ﷺ کی تصدیق کرے ”فیما بینه و بین الله“ مومن ہے اگرچہ زبان سے اقرار نہ کرے۔

اور حافظ الدین نسفیؒ اور ابو منصور ماتریدیؒ کا قول ہے جسکی طرف اشعریؒ کا بھی میلان ہے کہ وہ رکن زاید ہے اِسی وجہ سے حالت اکراہ اور عجز میں اقرار زبانی ساقط ہو جاتا ہے۔

چوتھے فرقہ کا قول ہے کہ ایمان فعل قلب ولسان و جوارح ہے یعنی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار اور جوارح سے اطاعت الٰہی کا کام لینا اس مجموع کا نام ایمان ہے۔اصحاب حدیث اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ اور اوزاعی رحمہم اللہ اِسی کے قائل ہیں۔اور معتزلہ اور خوارج اور زیدیہ کا بھی یہی قول ہے۔پھر اصحاب حدیث نے فعل قلب و جوارح میں اختلاف کیا ہے عبداللہ ابن سعید کہتے ہیں کہ فعل قلب معرفت الٰہی ہے اور وہی ایمان کامل ہے اور اُس کے بعد اطاعت علیحدہ ایمان ہے اور جحود اور انکار قلب کفر ہے پھر ہر معصیت علیحدہ کفر ہے لیکن جب تک معرفت اور اقرار نہ ہو کوئی اطاعت ایمان نہیں ہو سکتی اور جب تک جحود وانکار نہ ہو کوئی معصیت کفر نہیں اسلئے اصل طاعت ایمان ہے اور اصل معاصی کفر ہے اور فروع کا وجود بغیر اصل کے نہیں ہو سکتا۔

بعضے کہتے ہیں کہ ایمان تمام طاعت کا نام ہے خواہ فرائض ہوں خواہ نوافل اور وہ سب ملکر ایک ایمان ہے مگر جو شخص کوئی فرض چھوڑ دے تو اُسکا

ایمان ناقص ہوگا اور نوفل کے چھوڑنے سے نقص نہ ہوگا اور بعضے کہتے ہیں کہ ایمان صرف ادائے فرائض کا نام ہے۔

پھر معتزلہ کے اقوال مختلف ہیں واصل ابن عطاء اور ابو ہزیل اور قاضی عبدالجبار کا قول ہے کہ ایمان ہر طاعت کی ادائی کا نام ہے خواہ واجب ہو یا مستحب اور خواہ از قسم اعتقادات ہو یا اقوال و افعال ۔ابو علی جبائی اور ابو ہاشم کا قول ہے کہ وہ فقط ادائے واجبات کا نام ہے اور نظّام کا قول ہے کہ جس گناہ کے باب میں وعید وارد ہے اُس سے اجتناب کرنے کا نام ایمان ہے اور اُسکے بعض اصحاب کا قول ہے کہ ایمان کی شرط ہر کبیرہ سے بچنا ہے۔اور خوارج کا اتفاق اِس بات پر ہے کہ ایمان ان امور کے مجموعہ کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اور اُن چیزوں کی معرفت حاصل ہو جن پر دلیل عقلی یا نقلی قایم ہے اور اطاعت الٰہی اُن امور میں جن کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم وارد ہے خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے مذہب خوارج معتزلہ کے مذہب سے قریب قریب ہے اور ان دونوں کے قریب مذہب سلف و اہل حدیث ہے جن کے نزدیک تصدیق بالجنان و اقرار باللسان وعمل بالارکان کے مجموعہ کا نام ایمان ہے مگر فرق یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی طاعت کو ترک کرے خواہ افعال سے ہو یا اقوال سے معتزلہ کے نزدیک وہ ایمان سے

خارج ہوتا ہے لیکن کفر میں داخل نہیں ہوتا بلکہ دونوں کے بین بین رہتا ہے جس کو وہ منزلۃ بین المنزلتین کہتے ہیں اور خوارج کہتے ہیں کہ طاعت کے چھوڑتے ہی آدمی کفر میں داخل ہو جاتا ہے کیونکہ ایک طاعت کا بھی ترک اُنکے نزدیک کفر ہے اور سلف کے نزدیک وہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔ امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ ایمان تصدیق اور اقرار اور عمل کا نام ہے مگر مدارج مختلف ہیں جو تصدیق نہ کرے وہ منافق ہے اور جو اقرار نہ کرے وہ کافر ہے اور جو عمل نہ کرے وہ فاسق ہے اگرچہ دوزخ میں جائیگا مگر ہمیشہ اُس میں نہ رہے گا۔

آپ نے دیکھ لیا کہ اہل سلام کے جتنے فرقے ہیں سب کے نزدیک یہ مسلم ہے کہ جن چیزوں پر ایمان لانے کا حکم قرآن اور حدیث سے ثابت ہے مثلاً خدائے تعالےٰ کی ذات وصفات اور وجود ملائکہ اور رسالت نبی ﷺ اور دیگر انبیاء علیھم السلام اور قیامت اور جزا وسزا اور مسئلہ تقدیر جنکی تفصیل صفت ایمان میں مذکور ہے اِن سب امور کی تصدیق کی ضرورت ہے اور تصدیق بھی کیسی کہ جازم ہو اور بعضوں نے تو معرفت کی بھی ضرورت بتلائی جس کا مرتبہ تصدیق سے بھی زیادہ ہے۔ البتہ بعضوں نے ایمان کو عمل زبان کہا ہے مگر انکے نزدیک بھی تصدیق قلبی شرط ہے اور

کرامیہ گو اُس کی ضرورت نہیں سمجھتے اور صرف اقرار لسانی کو ایمان کہتے ہیں مگر اُن کا بھی یہی مطلب ہے کہ بغیر تصدیق قلبی کے اخروی نجات حاصل نہیں ہو سکتی اگرچہ دنیا میں لوگ زبانی اقرار کرنے والے کو مومن سمجھ لیں گے۔ اور معتزلہ نے تو ایمان کے مسئلہ میں نہایت ہی تشدد کیا ہے کہ علاوہ تصدیق و اقرار کے عمل کو اصل ایمان ہی میں داخل کر دیا چنانچہ جو شخص نماز و روزہ وغیرہ امور شرعیہ کو ادا نہ کرے اُس کو وہ ایمان ہی سے خارج کر دیتے ہیں۔ اور جہمیہ نے اس قدر تشدد کیا کہ ایمان معرفت کا نام رکھا جو کبھی زائل نہ ہو سکے اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی بعد معرفت زبان سے اقرار نہ کرے اور انکار ہی کرتا رہے جب بھی وہ کامل الایمان ہے اسلئے کہ معرفت ایسی قوی چیز ہے کہ انکار سے زائل نہیں ہو سکتی'' کمافی الملل والنحل للشہرستانی۔'' الحاصل کل فرقہ اسلامیہ کے نزدیک مسلم ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جو کچھ احکام بیان فرمائے ہیں ان کی جزا و سزا کی جزوی تصدیق ایمان میں معتبر ہے اور بغیر اسکے کسی فرقہ کے نزدیک وہ ایمان جو باعثِ نجات اخروی ہو صادق نہیں آ سکتا۔ اب خیال کیا جائے کہ تحصیل تصدیق میں کس قدر اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ بات پوشیدہ نہیں کہ جسکو کامل اور جزوی تصدیق امور مذکورہ کی ہوگی وہ شخص خدا

اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں کس قدر جاں فشانی اور جان بازی کرے گا۔ اسی کو دیکھ لیجئے کہ جب کوئی مستقل بیدار مغز بادشاہ شاہی احکام اپنی قلمرو میں نافذ کرتا ہے اور ہر ایک کام کی کرنے اور نہ کرنے پر جزا و سزا مقرر کر کے ایک دستور العمل مرتب کرتا ہے تو اسکی رعایا امتثال اوامر و اجتناب نواہی میں کیسی سرگرم ہو جاتی ہے کہ اگرچہ کسی کام میں اُن کا سراسر نقصان ہوا اور اُسکے کرنے یا ترک کرنے میں کتنی ہی مشققت ہو مگر خلاف حکم وہ کوئی کام نہیں کر سکتے وجہ اُسکی کیا ہے وہی ایک تصدیق اور یقین ہے کہ اگر عدول حکمی کریں گے تو مستحق سزا ہوں گے اب اسی پر قیاس کیجئے کہ جسکو یقین ہو کہ احکام الٰہی کے نہ ماننے یا پابندی نہ کرنے میں سزا ہوگی اور دوزخ میں جانا ہوگا جس میں اقسام کے عذاب ہیں اور امتثال اوامر میں استحقاق جنت ہے جس میں بے انتہا نعمتیں ہیں اور ابد الآباد وہ اس میں رہے گا تو وہ کس قدر احکام الٰہی کی پابندی کرے گا۔ اب یہاں قابل توجہ یہ بات ہے کہ جتنی پابندی حکم شاہی کی کی جاتی ہے اگر احکام الٰہی کی اتنی بھی پابندی نہ ہو تو کس طرح سمجھا جائے کہ ابدی جزا و سزا کی تصدیق اور یقین کیا گیا ہے پھر اگر یقین ہی میں کلام ہو تو اہل ایمان میں شامل ہونے کی کیا صورت اس لئے ہر مسلمان کو ضروری ہے کہ اپنی تصدیق اور

ایمان میں غور وفکر کیا کرے اور اس کو اس حد تک پہونچائے کہ جملہ احکام شرعیہ کی پابندی نفس پر آسان ہوجائے کیونکہ جب یقین اِس امر کا ہو جائے کہ نماز کو ترک کرنے سے آدمی دوزخ کا مستحق ہوجاتا ہے تو دن رات میں پانچ نمازیں ادا کرنا اس کے مقابلہ میں کوئی مشکل بات نہیں۔

اسی طرح سال بھر میں ایک مہینے کے روزے رکھ لینا اور سو روپیہ جمع ہوں اور سال بھر رہیں تو ڈہائی روپیہ اُس کی زکوٰۃ ایک مشت یا بدفعات اپنے مفلس قرابتداروں یا فقرا کو دینا۔ اور عمر بھر میں ایک بار حج کو جانا اُن آفتوں کے مقابل کون سی بڑی بات ہے آج کل مذہب معتزلہ وقعت کی نظروں سے دیکھا جارہا ہے یہاں تک کہ بعض لوگ تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہم معتزلی ہیں وجہ اسکی یہی ہوگی کہ آج کل حکمت کا مذاق غالب ہے اور معتزلہ نے حکما کو اکثر مسائل میں اپنا پیشرو بنالیا تھا اکثر وہ انہیں کے دلائل سے مدد لیتے ہیں مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن حضرات کو معتزلہ کے مذہب سے بھی کوئی تعلق نہیں اسلئے کہ معتزلہ نے عمل کے باب میں یہاں تک سختی کی ہے کہ نفس ایمان اسی کو قرار دیا ہے چنانچہ شرح مواقف ان کا قول نقل کیا ہے کہ ادائی واجبات دین ہے اور دین اسلام ہے۔ اور اسلام ایمان ہے۔ جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ ادائے واجبات ایمان ہے

اوران دعووں کے دلائل میں وہ جائے گا قرآنیہ پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ادائے واجبات کا اسلام ہونا اس آیت سے ثابت کرتے ہیں۔ ''وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤتُوا الزَّکوٰۃَ وَذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃ'' اورقائم کریں نماز اور دیں زکوٰۃ اور یہ ہے اور راہ مضبوط لوگوں کی''۔ اِس سے ظاہر ہے کہ نماز ادا کرنا اور زکوٰۃ دینا ملت قیمہ یعنی مسلمانوں کا دین ہے اور دین کا اسلام ہونا اِس آیہ شریفہ سے ثابت ہے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِ سْلَامُ اور اسلام کا ایمان ہونا اس آیت شریفہ سے معلوم ہوتا ہے ''وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ'' یعنی جو شخص سوائے اسلام کے کوئی دین طلب کرے تو اُس سے وہ دین قبول نہ کیا جائے گا جس سے ظاہر ہے کہ غیر اسلام اگر ایمان ہو تو وہ قابل قبول نہیں۔ اور اس آیت سے بھی ثابت کرتے ہیں'' قولہ تعالیٰ فَاَخْرَجْنَا مَنْ کَانَ فِیْھَا مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فَمَا وَجَدْنَا فِیْھَا غَیْرَ بَیْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ'' پس نکال دیا ہم نے اُس بستی سے جتنے اُس میں ایمان والے تھے اور ہم نے مسلمانوں کے ایک گھر کے سوا اُس میں پایا نہیں۔'' سیاق وسباق سے ظاہر ہے کہ مستثنیٰ بیتاً من المومنین ہے اور تقدیر یہ ہوگی ''فما وجدنا بیتا من المومنین الا بیتا من المسلمین'' جس سے ظاہر ہے کہ مومن وہی ہیں جو مسلمین ہیں۔

غرضکہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ اوامر کو بجالانے اور شراب خوری اور ربوٰ وغیرہ کبائر سے اجتناب کرنے میں انہوں نے حد سے زیادہ تشدد کیا ہے چنانچہ ابن حزم اور شہرستانیؒ نے ملل اور نحل میں اُنکا عقیدہ بیان کیا کہ اگر کوئی عمر بھر عبادت کرے مگر کبھی ایک کبیرہ کا مرتکب ہوا کرتا ہو یا ایک نماز یا روزہ قصداً ترک کردے اور قبل توبہ مرجائے تو وہ قطعاً دوزخی ہے اور فرعون اور ابولہب کے ساتھ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا پھر اگر خدائے تعالیٰ بھی اُسکو دوزخ سے نکالنا چاہے تو نہ نکال سکے گا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں اِس قدر اُن کو اہتمام ہے کہ اگر کوئی شخص کہنے سننے سے نہ مانے تو تلوار سے اُس کو منانا چاہئیے۔

دیکھئے دینی معاملات اور اعمال کی طرف کس قدر اُنکی توجہ مبذول ہے۔ ہمارے معاصرین گو معتزلی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور مذہب معتزلی کی تعریف کرتے ہیں اور عملی ثبوت بھی دیتے ہیں کہ مختلف فیہ مسائل میں معتزلہ کے دلائل سے اہل سنت جماعت کے مذہب کو رد کرتے ہیں مگر انکے عمل کی جانب نگاہ ڈالی جاتی ہے تو اس کا نام تک نہیں سنا جاتا پھر ان کو معتزلی کیونکر سمجھا جائے ادنیٰ توجہ سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ نہ وہ سنی ہیں نہ معتزلی نہ شیعی وغیرہ صرف مسلمانوں کی دل آزاری اور

تفرقہ اندازی کی غرض سے ردوقدح کا بکھیڑا اور جھگڑا لگا رکھا ہے۔ خیر حق تعالیٰ ہم کو اور اُن کو نیک توفیق عطا فرماوے۔

قصد السبیل میں لکھا ہے کہ ایمان شرعی کی تعریف علماء نے یہ کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو احکام پہنچائے ہیں اور ضروری طور پر اُن کا علم ہوا ہے اُنکی تصدیق اس طور سے کیجائے کہ جو امور تفصیلاً معلوم ہوئے ہیں اُن کی تصدیق تفصیلاً اور جو اجمالاً معلوم ہوئے اُنکی تصدیق اجمالاً ہونا خواہ وہ دلیل سے حاصل ہو یا بغیر دلیل کے لیکن یہ ضروری امر ہے کہ تصدیق جزوی ہو۔

تعریف میں جو قید لگائی گئی کہ جو امور کہ ضروری طور سے معلوم ہوئے ہوں اُس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جس کو عوام الناس بھی سمجھ سکتے ہیں اور اُنکے معلوم کرنے میں نظر وفکر کی ضرورت نہیں جیسے وحدانیت اور نبوت اور نماز و روزہ و حج و زکوٰۃ وغیرہ۔ بخلاف اُن مسائل کے جو اجتہاد سے معلوم ہوتے ہیں اور تفصیلی امور سے مراد وہ امور ہیں جنکا ذکر مفصلاً ہوا ہے جیسے ملائکہ میں جبرئیل ومیکائیل وغیرہ اور انبیا میں موسیٰ وعیسیٰ وغیرہ علیہم السلام اور کتابوں میں توراۃ انجیل وغیرہ اور اجمالی امور سے مراد وہ امور ہیں جنکی تفصیل معلوم نہ ہو جیسے کل انبیاء اور

کل کتب وملائکہ اس میں اسی قدر ضرورت ہے کہ ہم سب پر ایمان لائے۔

حاصل یہ کہ جن چیزوں کا وجود ظاہری طور اس طرح ثابت ہے کہ عوام الناس بھی سمجھ لیتے ہیں جیسے فرشتوں کا وجود کہ اُن کا آسمانوں سے اُترنا اور چڑہنا وغیرہ امور قرآن شریف میں بیان کئے گئے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ اُن کا وجود مستقل ہے وہ ہمارے قویٰ نہیں ہیں ایسے امور پر ایمان لانے کی ضرورت اگر کوئی تاویلیں کر کے کہے کہ فرشتے بھی ہمارے قویٰ ہیں انکے سوا کوئی چیز نہیں تو سمجھا جائے گا کہ وہ قرآن پر ایمان نہیں لایا۔

تصدیق

ایمان میں چونکہ تصدیق معتبر ہے اِس لئے ضرور ہے کہ اُسکے بھی معنی سمجھ لئے جائیں ''کشاف الاصطلاحات'' میں لکھا ہے کہ لغت میں تصدیق کے معنی یہ ہیں کہ کسی قائل کیطرف صدق کی نسبت کیجائے خواہ وہ دل سے ہو یا زبان سے اور تصدیق معرفت میں یہ فرق ہے کہ تصدیق ضد انکار ہے اور معرفت ضد جہالت ونکارت امام غزالیؒ نے جو لکھا ہے کہ تصدیق تسلیم کرنے کا نام ہے اس میں اسی طرف اشارہ ہے اسلئے کہ تسلیم انکار اور استکبار کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔ امام غزالیؒ نے اُس کی تفصیل

اس طرح کی ہے کہ تصدیق ربط قلبی کا نام ہے جو امر کسبی ہے کہ مصدق اپنے اختیار سے کرتا ہے اسی واسطے لوگ ایمان کے مامور ہیں اور اس پر ثواب حاصل ہوتا ہے اور وہی تصدیق تمام عبادتوں کا سر ہے بخلاف معرفت کے کہ وہ بغیر اختیار کے ہی حاصل ہوسکتی ہے جیسے کسی دیوار یا پتھر پر نظر پڑتے ہی بے اختیار معرفت حاصل ہوجاتی ہے کہ وہ دیوار یا پتھر ہے۔ اور تصدیق میں خصوصاً تصدیق شرعی میں واجب ہے کہ وہ کسبی ہوملا عبدالحکیمؒ نے حاشیہ خیالی کی بحث ایمان میں لکھا ہے کہ اس پر تو اتفاق ہے کہ معرفت مذکورہ تصدیق لغوی سے خارج ہے مگر اس میں اختلاف ہے کہ آیا وہ تصور میں داخل ہے یا تصدیق منطقی میں صدر الشریعہؒ لکھتے ہیں کہ وہ تصدیق منطقی میں داخل ہے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ تصور ہے انتہیٰ۔

حاصل یہ کہ ایمان میں جو تصدیق معتبر ہے معرفت پر صادق نہیں آتی اسلئے کہ اہل کتاب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری معرفت حاصل تھی کہ آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اسلئے کہ کتب سابقہ میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل وحالات برابر مذکور ہیں جن کے مطابق انہوں نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا پھر ولادت شریف کے زمانہ میں کاہنوں کا خبریں دینا کہ آپ کا ظہور قبیلہ قریش میں ہوگا اور ہر طرف ہاتفوں کی پکار کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوگئے اور بتوں کا سر

بسجود ہو جاتا وغیرہ حیرت انگیز امور جو ولادت شریف کے وقت اور اُسکے قبل و بعد ظہور میں آئے جو کتب احادیث میں مصرح ہیں ۔ پھر آنحضرت ﷺ کے غیر معمولی حرکات وسکنات اور جامع فضائل صوری و معنوی ہونا جو خاصہ منتخب افراد انسانی اور انبیا کا ہے یہ سب امور ایسے ہیں کہ جس ذات میں جمع ہوں ممکن نہیں کہ وہ معمولی آدمی سمجھا جائے بلکہ وہ آپ ﷺ کے رتبہ عالیہ کی طرف توجہ دلانے میں کافی ووافی تھے پھر جب آپ ﷺ نے دعوٰی نبوت کیا اور وقتاً فوقتاً معجزے دکھانے لگے جن کا ظہور قدرت مخلوق سے خارج اور خاص قدرت الٰہی سے متعلق ہے اور کلام الٰہی پڑھ پڑھ کر سُنانے لگے جس میں علاوہ تاثیرات روحانیہ کے فصاحت وبلاغت میں بھی اس درجہ پر ہے کہ تمام جن وانس اُس کے جیسا کلام بنانے سے عاجز ہیں اور باوجود اس عام اعلان کے ’’ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَ كُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ‘‘ فصحائے عرب دم نہ مار سکے تو بتایئے کہ اتنے براہین قاطعہ اور مشاہدات کے بعد ایسا کون بلید الذہن اور پاگل ہوگا کہ اُسکو معرفت حاصل نہ ہوئی ہو غرضکہ عموماً کفار خصوصاً اہل کتاب کو حضرت ﷺ کی معرفت ضرور حاصل تھی چنانچہ خود حق تعالیٰ اسکی گواہی دیتا ہے ’’ کما قال تعالیٰ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنَا

ھُمُ الْکِتَابَ یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَ ھُمْ ‘‘یعنی جس طرح ہر روز و دیکھنے سے اپنے لڑکوں کی معرفت تامہ حاصل ہوتی ہے کہ آدمی ہزار لڑکوں میں اپنے لڑکے کو پہچان لیتا ہے اسی طرح کثرت علامات وامارات ومعجزات کی وجہ سے اہل کتاب نبی ﷺ کو پہچانتے ہیں کہ وہ نبی آخر الزماں ﷺ ہیں ۔دیکھئے باوجود اتنی معرفت کے اُنکو مسلمان نہیں کہہ سکتے اسلئے کہ تصدیق لغوی ان میں نہیں پائی گئی کیونکہ وہ تکبر اور عناد کی راہ سے گویا یہ بات کہتے تھے کہ یہ سب کچھ سہی مگر ہم تصدیق کی نسبت انکی طرف کبھی نہ کرینگے کہ وہ اپنے دعووں میں صادق ہیں اگرچہ مقتضیٰ اس معرفت کا یہ تھا کہ وہ تصدیق کر لیتے مگر تعصب مذہبی نے اُنکو اُس سے روکا اور کافر کے کافر رہے اور وہ معرفت بیکار گئی بلکہ وہی وبال جان ہوئی کیونکہ جان بوجھ کر ایمان نہ لانے والا بہ نسبت نادان کے زیادہ مواخذہ کے قابل ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ نفس معرفت ایمان نہیں بلکہ اُسکے بعد اپنے قصد سے ایمان لانے کی ضرورت ہے۔

محقق تفتازانیؒ نے شرح مقاصد میں بعض متاحرین کا قول نقل کیا ہے کہ ایمان میں معتبر وہ تصدیق ہے جو اختیار سے حاصل ہو یعنی متکلم کی طرف صدق کی نسبت اختیار سے کی جائے اختیار کی قید اس غرض سے لگائی گئی

کہ تصدیق شرعی تصدیق منطقی سے ممتاز ہوجائے اس لئے کہ تصدیق منطقی کبھی بغیر راختیار کے بھی ہوتی ہے مثلاً انبیا علیہم السلام جب نبوت کا دعویٰ کرکے معجزات دکھائے تو بعضوں کو اُنکا صدق بے اختیار دل میں واقع ہوجاتا تھا باوجود اس کے اُنکا تصدیق کرنا بحسب لغت صادق نہیں آتا اسلئے وہ شرعاً بھی ایمان نہیں ہوسکتا اصل یہ ہے کہ تصدیق ماموربہ ہے اس کا مقدور اور اختیاری ہونا ضرور ہے اور وہ کیفیت جو اُن کے دل میں پیدا ہوگئی تھی وہ اختیاری نہ تھی بلکہ ایک علم تھا جسکو کیفیت نفسانی کہتے ہیں یا انفعال یعنی قلب میں اِس معنی کا حصول بہرحال اُس پرفعل قلبی صادق نہیں آتا جو ماموربہ ہے اس سے ثابت ہوا کہ تصدیق علم پر ایک زاید چیز ہے اُس میں یہ ضرور ہے کہ اختیار سے ایقاع نسبت ہو جسکو کلام نفسی اور عقد قلب کہنے میں ہر چند سوفسطائی وجود نہار کا عالم ہو مگر اُسکو لغتہً مصدق نہیں کہہ سکتے اِس طرح کفار مذکورین گو جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہیں مگر اُنکو مصدق نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ اُنہوں نے وہ حکم اختیار سے نہیں کیا تھا اور بجائے تصدیق کرنے کے ہمیشہ منکر رہے الغرض شرعی تصدیق منطقی تصدیق نہیں ہے۔ محقق مذکور نے اس قول کو نقل کرکے اُسپر چند اعتراض کئے ہیں۔

(۱) مامور بہ کے مقدور واختیاری ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ مقولہ کیفیت سے نہ ہو بلکہ یہ کافی ہے کہ اُسکے ساتھ قدرت کا تعلق صحیح ہو اور حصول اُسکا کسب اور اختیار سے ہو سکے خواہ مامور بہ فی نفسہ اوضاع اور ہیئات سے ہو جیسے قیام وقعود یا کیفیات سے جیسے علم ونظر حق تعالیٰ فرماتا ہے ''فَاعْلَمْ اَنَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ. فَانْظُرْ مَاذَا فِی السَّمٰوٰتْ''۔اِن دونوں آیتوں میں مامور بہ علم ونظر ہیں جو کیفیات سے ہیں۔یا حرکات وسکنات سے جیسے نماز یا ترک ہو جیسے روزہ باوجودیکہ یہ امور مقولہ فعل سے نہیں ہیں مگر مامور بہ ہیں اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ کیفیت قلبیہ مامور بہ ہے جسکے ساتھ قدرت کا تعلق صحیح ہے اور اگر مامور بہ کا فعل بمعنی تاثیر ہونا لازم وضروری ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایمان کا واقع کرنا اور اُسکا اکتساب وتحصیل مامور بہ ہے جیسے تمام واجبات میں ہوا کرتا ہے اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایمان مقولہ فعل سے ہو بلکہ اُسکا واقع کرنا مقولہ فعل سے ہوگا نہ نفس ایمان۔

(۲) کوئی ضرورت نہیں کہ ہم تصدیق منطقی سے تصدیق لغوی کو علیحدہ اور ممتاز کریں خود شیخ نے جو فن منطق میں مقتدا ہے تصریح کی ہے کہ تصدیق منطقی جو علم کی ایک قسم ہے وہ بعینہ تصدیق لغوی ہے جسکی تعبیر فارسی میں گردیدن سے کیجاتی ہے اور مقابل تکذیب ہے چنانچہ دانش نامہ علائی

میں لکھا ہے۔ دانش دو گونہ است یکی دریافتن و دررسیدن وآن رابتازی تصور خوانند و دوم گردیدن وآن رابتازی تصدیق خوانند۔ اِس سے ظاہر ہے کہ تصدیق منطقی اور لغوی دونوں ایک ہی ہیں اور شفا میں لکھا ہے۔ ''التصدیق فی قولک البیا ض عرض ھوان بحصیل فی الذھن نسبۃ صورۃ ھذالتا لیف الی الا شیاءِ انھامطابقۃ لھا والتکذیب یخالف ذالک'' اِس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ تصدیق نسبت تامہ کا ذہن میں حاصل ہوجانا ہے جیسے بعضوں نے سمجھا ہے بلکہ مقصود اُن کا یہ ہے کہ تصدیق حصول اِس امر کا ہے کہ طرفین مولف کے درمیان جو نسبت ثبوتی یا سلبی ہے اُسکو ذہن نفس الامر کی طرف نسبت کرے کہ یہ نسبت واقع کے مطابق ہے جس کی تعبیر فارسی میں صادق داشتن وگردیدن ہے چنانچہ صاف لکھا ہے کہ وہ ضد تکذیب ہے جسکے معنی فارسی میں کاذب واشتن ہیں اس تقریر سے وہ اعتراض بھی دفع ہوگیا کہ حکم جب فعل اختیاری ہے یعنی اتفاح وانتزاع تو وہ نفس تصدیق یا جز تصدیق کیونکر ہوسکتا ہے اسلئے کہ تصدیق علم کی قسم ہے جو مقولہ کیف یا انفعال سے ہے ممکن نہیں کہ وہ مقولہ فعل سے ہوسکے۔ اِس اعتراض کا جواب تقریر سابق سے یہ سمجھا گیا کہ تصدیق شیخ کے نزدیک

حصول ذہنی کا نام ہے ۔ نہ فعل ذہن کا۔اور کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ استاد وایقاع وغیرہ الفاظ وعبارات ہیں درحقیقت نفس کا وہاں کوئی فعل نہیں ہے بلکہ صرف اذعان وقبول ہے اور ادراک اِس امر کا ہے کہ نسبت واقع ہے یانہیں ۔البتہ اس تصدیق کا حصول کبھی کسب سے ہوتا ہے کہ اسباب واختیار کام میں لائے جاتے ہیں مثلاً ذہن وحواس ونظر کو متوجہ کرنا اور کبھی بغیر اسکے جیسے دہوپ پڑتے ہیں آدمی خود سمجھ جاتا ہے کہ آفتاب نکلا ہے لیکن مامور بہ کیلئے ضرور ہے کہ قسم اول سے یعنی اختیاری ہو۔اِس تقریر پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جب یقین کے ساتھ اذعان وقبول نہ ہو بلکہ جحود وانکار ہو جیسے سوفسطائی اور کفار کا یقین تھا تو اُسکو تصور کہنا چاہئے کیونکہ تصدیق میں اذعان کی ضرورت ہے حالانکہ اُسکو تصور کہنا صریح البطلان ہے۔اِسکا جواب یہ ہے کہ یہاں ہمارا دعویٰ اسی قدر ہے کہ منطقیوں کے رئیس نے جو تصدیق کی تفسیر کی ہے وہ تصدیق لغوی اور مقابل تکذیب ہے پھر مطلقاً یہ کہنا کہ ایمان میں تصدیق منطقی معتبر نہیں ہے درست نہیں۔ غایۃ الامر یہ ہے کہ ایمان میں اور بھی چند شرایط معتبر ہیں۔رہا یہ کہ شیخ کی تفسیر پر یہ لازم آتا ہے ک جس یقین کیساتھ اذعان وقبول نہوں وہ تصور ہوگا یا تصور وتصدیق دونوں سے خارج ہوگا سو یہ بحث دوسری ہے۔

(۳) تصدیق کے معنی جو کہے جاتے ہیں کہ وہ دل سے متکلم کی طرف صدق کی نسبت کرنا ہے اُسکے معنی سوائے اِسکے کہ متکلم کے صادق ہونے کا ادراک اور اذعان ہو اور کیا ہو سکتے ہیں کیونکہ اس تصدیق کے وقت سوائے اُس ادراک کے قلب کا اور کوئی فعل اور تاثیر خیال میں نہیں آتی اِس سے ہمیں یقین ہوتا ہے کہ وہ نفس کی ایک کیفیت ہے جو کبھی کسب واختیار ومباشرت اسباب سے حاصل ہوتی ہے اور کبھی بغیر اسکے۔

غایۃً الامر یہ ہے کہ ایمان میں جو کیفیت قلب معتبر ہے وہ کسبی ہے۔ اسلئے کہ ایمان مامور بہ ہے اور مامور بہ کا اختیار سے حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور اگر ایمان، تصدیق مقولہ فعل سے ہوں تو یہ کہنا پڑے گا کہ آدمی صرف حالت مباشرت، تحصیل میں حقیقۃً ایمان کیساتھ متصف ہے جیسا کہ مقولہ فعل کے معنی سے یہ بات ظاہر ہے۔

(۴) اکابر دین کے کلام میں لفظ تصدیق کی جگہ معرفت وعلم واعتقاد بھی مستعمل ہیں۔ چنانچہ علی کرم اللہ وجہ فرماتے ہیں کہ ایمان معرفت ہے اور معرفت تسلیم اور تسلیم تصدیق ہے اسلئے چاہئے کہ تصدیق جو بمعنی گردیدن ہے وہ بھی علم ہی کے معنی میں ہو تا کہ سب ایک جنس ہو جائیں۔ البتہ ایمان میں چند قیود شرط ہیں جیسے تحصیل واختیار وترک جحود واستکبار انتہیٰ ملخصاً۔

اگرچہ محقق کی تقریر سے معلوم ہوا کہ تصدیق لغوی و منطقی ایک ہی ہیں مگر یہاں یہ معلوم کرنا مناسب ہے کہ بعض متاخرین نے جنکی تقریر محققؒ نے نقل کی ہے تصدیق شرعی یعنی لغوی کو تصدیق منطقی سے کیوں علحدہ کیا منشاء اسکا یہ معلوم ہوتا ہے کہ تصدیق منطقی علم کی قسم ہے جو منطقین کے نزدیک ظنیات کو بھی شامل ہے۔ چنانچہ ''کشاف الاصطلاحات'' میں لکھا ہے

التصدیق اللغوی قطعی و المنطقی اعم من القطعی و الظنی لکونہ من العلم الشامل للظنی و القطعی عندالمنطقین اور مولانا فضل حق نے حاشیہ قاضی میں لکھا ہے کہ تصدیق ضعیف بھی ہوتی ہے اور شدید اور اشد بھی۔ضعیف جیسے ظن اور شدید تقلید اور اشد یقین۔اور مشائین کے نزدیک مسلم ہے کہ شدید اور ضعیف مختلف انواع ہوا کرتے ہیں اس وجہ سے تصدیق کے تحت میں مختلف انواع ہوں گے غرضکہ منطق میں چونکہ عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ علم کی دو قسم ہیں تصور و تصدیق اور تصدیق ظنی بھی ہوتی ہے اور تصدیق ایمانی ظنی نہیں ہوسکتی بلکہ اُسکا یقین ہونا شرط ہے اسوجہ سے بحث ایمان میں بھی ضرور ہوا کہ تصدیق شرعی تصدیق منطقی سے بالکل علحدہ کرلی جائے تاکہ یہ وہم بھی نہ ہو کہ تصدیق ظنی بھی ایمان کے لئے کافی ہے۔''مراقی الفلاح'' میں شرنبلا ی نے لکھا ہے المومن ھوالذی

یعتقد بقلبہ دین الاسلام اعتقادا جازماً خالیاً عن الشک یعنی مومن وہی ہے جو دل سے دین اسلام کا جزمی اعتقاد رکھے جس میں کسی قسم کا شک نہ ہو۔

علامہ تفتازانیؒ نے ''تہذیب الکلام'' میں لکھا ہے کہ جب تصدیق یہ ٹھیری کہ اذعان اور قبول کے ساتھ یقین ہو جو اختیار و کسب سے حاصل ہو جائے تو یہ لازم آئے گا کہ جو یقین کہ اذعان سے خالی ہو۔ (جیسے سوفسطائی اور بعض کفار کا یقین) تصدیق نہ ہو بلکہ تصور ہو یا تصور و تصدیق کے بیچ میں واسطہ ثابت کیا جائے اور جو یقین مقارن اذعان بغیر کسب کے حاصل ہو اہو جیسے ملائکہ اور انبیا علیہم السلام کا یقین اس کو مکتسب کہیں یا یہ کہا جائے کہ دوبارہ اُس کو اختیار سے حاصل کرنے کی انہیں ضرورت ہے حالانکہ یہ سب لوازم محل تامل ہیں۔انتہیٰ۔

شیخ وسم کردستانی نے اُس کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ سب خرابیاں اس وجہ سے لازم آرہی ہیں کہ تصدیق ایمان، عموم و خصوص میں منطقی تصدیق کے مساوی بتائی جارہی ہے حالانکہ تصدیق منطقی عام ہے جس میں ظنیات شامل ہیں اور تصدیق شرعی ولغوی خاص جسکا قطعی ہونا شرط ہے۔ اگر ایمان کی تعریف یوں کی جاتی کہ تصدیق منطقی کی جنس سے ہے۔ مگر اُس میں اور بھی چند شرائط ہیں کہ اعتقاد جازم اختیار سے حاصل کیا جائے

اور جحو دو استکبار سے خالی ہو تو غیر اذعانی یقین (جو سوفسطائی اور کفار کو تھا) اُسکو نہ تصور کہنے کی ضرورت ہوتی نہ واسطہ ثابت کرنے کی بلکہ وہ تصدیق ایمانی سے خارج اور تصدیق منطقی میں داخل رہتا۔ تعریف مذکور میں ایمان کو تصدیق منطقی کی جنس سے کہنے کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ بعضوں نے اُسکو کلام کہا ہے اور بعضوں نے فعل نفس حالانکہ وہ بھی ایک قسم کی تصدیق جنس علم سے ہے جو مقولہ کیف سے ہے اصل منشاء اِس اضطراب کا یہ ہے کہ اذعان دو معنی میں مستعمل ہے مرادف تصدیق منطقی اور بمعنی تسلیم و ترک جحو دو استکبار، چونکہ دونوں تصدیقوں میں یہ لفظ مستعمل ہے اس لئے اشتباہ ہوا کہ سوفسطائی کو اذعان نہیں حالانکہ اذعان منطقی وہاں موجود ہے البتہ وہ اذعان نہیں جو ایمان میں معتبر ہے۔ انتہیٰ۔

محقق تفتازانیؒ کو شرح مقاصد میں اصرار ہے کہ تصدیق شرعی تصدیق منطقی ہے یعنی علم اور مقولہ کیف سے ہے اور جو دشواریاں اُس میں واقع ہوتی ہیں اُن کو تہذیب الکلام میں بیان کر دیا۔ محشی کردستانی نے جو اُنکے دفع کرنے کی فکر کی وہ محققؒ ہی کے کلام سے مستفاد ہے چنانچہ یہ اُن کا قول ابھی معلوم ہوا کہ غایۃ الامر یہ کہ ایمان میں اور بھی چند شرائط معتبر ہیں مگر ہنوز اُس میں کلام کو گنجائش ہے۔

محقق نے دوسرے اعتراض میں جو اوپر مذکور ہوا لکھا ہے **فلم یجعل الشیخ التصدیق حصول النسبة التا مة فی الذھن علی ما یفھمہ البعض بل حصول ان ینسب الذھن الثبوت او االا نتفاء الذی بین طرفے المولف الی مافی نفس الا مر بالمطابقہ ومعنا ہ نسبة الحکم الی الصدق اعنی صادق داشتن و گرویدن و بینہ بانہ ضد الکذب الذی معنا ہ النسبة الی الکذب اعنی کا ذب داشتن** ہر چند محققؒ کو اس تقریر سے یہ ثابت کرنا ہے کہ تصدیق علم اور مقولہ کیف سے ہے۔ مگر اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ تصدیق کے وقت ذہن کا کوئی فعل جس پر ینسب الذھن الثبوت اور نسبۃ الحُکم الی الصدق اور صادق داشتن اور انہ ضد الکذب بالذی معنا ہ النسبۃ الی الکذب اعنی کا ذب داشتن دلالت کر رہے ہیں یہ اور قابل تسلیم ہے کہ زید قائم کی صورت ترکیبیہ گو ذہن میں موجود ہے نفس زید اور قایم کی طرف اس طرح منسوب کرنا کہ وہ محکی عنہ کے مطابق ہے یا یوں کہئے کہ حکم کی نسبت صدق کی طرف کرنا نفس کا فعل ہے جیسے ہر شخص جانتا ہے کہ تکذیب نفس کا فعل ہے جس پر مقولہ کیف ہرگز صادق نہیں آ سکتا یہ فعل اگر اذعان کفار میں ہے اور تصدیق منطقی کے لئے وہ کافی ہے تو ایمانی

تصدیق کے لئے دوسرے فعل کی ضرورت ہے اور اگرنہیں ہے تو تصدیق سے اُسکو خارج سمجھنا چاہیئے اور چونکہ محقق نے اُسکو تصدیق منطقی میں داخل کیا ہے تو معلوم ہوا کہ تصدیق منطقی اورلغوی ایک نہیں ہیں حالانکہ شیخ کہ کلام سے ثابت ہے کہ دونوں ایک ہیں۔ذکرالشیخ فی ” الشفا“ان الشیء یعلم علی وجھین، أحد ھماأن یتصور فقط کما اذا کان لہ اسم فینطق بہ مثل معنا ہ فی الذھن وان لم یکن ھنا ک صدق او کذب کما اذاقیل انسان أوقیل افعل کذا فانک اذاوقفت علی معنی مایخاطب بہ من ذالک کنت تصور تہ، والثانی أن یکون مع التصور تصدیق کمااذاقیل لک مثلاً ان کل بیاض عرض لم یحصل من ھٰذالتصورمعنی ھٰذا لقول فقط بل صدقت انہ کذالک امااذاشککت انہ کذلک فقد تصورت مایقال لک فانک لا شک فیمال تتصورہ ولا تفھمہ ولکن لم تصدق بہ بعد فکل تصدیق یکون معہ تصورولا ینعکس فالتصورفی مثل ھٰذالمعنی یفید ک ان تحدث فی الذھن صورۃھذالتا لیف ومایو لف منہ کا لبیا ض والعرض والتصدیق وھوان یحصل

فی الذهن نسبة الصوره الی الاشیاء انفسها انها مطابقه لها والتکذ یب یخا لف ذلک انتھے[1]۔

دیکھئے شیخ کا یہ قول کہ ''جب تم سے کل بیاض عرض کہا جائے تو اسکے معنی تمہیں صرف تصور ہی نہ ہوگا بلکہ اُسکی تصدیق بھی کروگے کہ وہ ایسا ہی ہے '' صاف کہہ رہا ہے کہ تصدیق گویا کسی کے قول کی ہوا کرتی ہے۔ پھر اُسکی تصدیق اس طور سے کہ وہ ایسا ہی ہے گویا نفس کا قول ہے جو اُس کے خطاب کے جواب میں کہا جا رہا ہے اور یہ محاورہ میں بھی کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے یہ کہا اور میں نے اُسکی تصدیق کی ۔شیخ بھی اُس کی تصدیق کررہے ہیں اور نیز شیخ کا یہ قول کہ التکذیب یخالف ذالک ای التصدیق اسی پر قرینہ ہے اسلئے کہ اصطلاحی لفظ اگر ہے تو تصدیق ہے اُسکو چاہیں کیف سے کہیں یہ انفعال سے مگر تکذیب کی معنی میں کوئی اصطلاحی تصرف نہیں ہوا اسلئے اُسکے معنی صرف جھٹلانے کے ہیں جو مقولہ فعل سے ہے۔ پھر جب شیخ نے تصدیق کو ضد تکذیب کہا تو اس سے مستفاد ہوا کہ وہ دونوں ایک ہی مقولہ سے ہیں چنانچہ محقق موصوف نے اسی بحث میں لکھا ہے ومعنی التصدیق نسبۃ الحکم الی الصدق اعنے صادق داشتن دگرویدن وبینہ بانہ ضد التکذیب الذی معناہ النسبۃ الی الکذب اعنی کاذب داشتن۔

دیکھئے صادق داشتن و کاذب داشتن ایک ہی قسم کی بات ہے غرض اس اعتبار سے تصدیق منطقی بعینہ تصدیق لغوی ہوئی یعنی دونوں مقولہ فعل سے ہوں گے چنانچہ محققؒ کو بھی اُسکا اقرار ہے جیسا کہ شرح مقاصد میں لکھتے ہیں وھوالقدوۃ فی فن المنطق والثقہ فی تفسیر الفاظہ وشرح معانیہ صرح بان التصدیق المنطقی الذی قسم العلم الیہ والی التصور ھو بعینہ اللغوی۔ اگرچہ محقق اس بات پر راضی نہیں کہ تصدیق مقولہ فعل سے ہو لیکن شیخ نے تصدیق کو جب مقابل تکذیب کہدیا اور اُسکو خطاب کی تصدیق قرار دی تو اُسکو مقولہ فعل سے قرار دینا اور کلام نفس کہنا شیخ کے خلاف مرضی نہ ہوگا۔

''قصد السبیل'' میں لکھا ہے کہ اگر کہا جائے کہ شیخ کے قول سے ثابت ہوتا ہے، تصدیق علم ہے اِس لئے کہ ذہن میں جو نسبت صورت ذہنیہ کی اشیاء کی طرف ہوتی ہے وہ سوائے اِس ادراک کے نہیں کہ وہ صورت مطابق اشیاء کے ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ادراک اذعان کو مستلزم نہیں اسلئے کہ شیخ الاسلام ابوعبداللہ نے ''تحریر المطالب فی شرح عقیدہ ابن حاجب'' میں قول ابی جہل کا نقل کیا کہ **نعلم أن محمد ا** صلی اللہ علیہ وسلم **نبی ولکن لا نو من به ابدا**۔ اِس سے ظاہر ہے کہ وہ ادراک مستلزم تصدیق بھی نہیں چہ جائے کہ نفس تصدیق ہو۔ انتہیٰ۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ صورت ذہنیہ کی نسبت اشیاء کی طرف کرنا سوائے ادراک کے اور کوئی بات نہیں چنانچہ محققؒ نے بھی اعتراضات مذکورہ کے ضمن میں اسی قسم کی بات لکھی کہ تصدیق ایمانی سوائے ادراک کے اور کوئی چیز سمجھ میں نہیں آتی سوفی الحقیقۃ درست ہے تصدیق کے وقت ذہن میں کیفیت ادراک کی ضرور ہوتی ہے مگر اسکا بھی انکار نہیں ہوسکتا کے دوسرے مقولات کے مصادیق بھی وہاں موجود ہیں چنانچہ قصد السبیل میں لکھا ہے کہ ''فانہ ای الشیخ یفسر العلم تارۃ بالتجرد عن المادۃ وھوراجع الی امرعدمی وتارۃ یجعلہ مندرجافی مقولۃ الکیف وفی مقولۃ المضاف بالعرض فیجعلہ عبارۃ عن صفۃ ذات اضافۃ وتارۃ یجعلہ عبارۃ عن الصورۃ المرتسمۃ فی الجوھر العاقل المطابقۃ لماھیۃ المعقول وتارۃ یجعلہ عن مجرد اضافۃ فاقوالہ دائرۃ بین ان یجعلہ امراعدمیا اوکیفااواضافۃ'' ان تصریحات شیخ سے ظاہر ہے کہ سب امور ذہن میں موجود ہوتے ہیں۔ اِس سے دوسرے اقوال سے جو علم کے باب میں وارد ہیں یہ ثابت ہے کہ ادراک کے وقت کئی چیزیں ذہن میں پائی جاتی ہیں چنانچہ منجملہ اُن کے ایک صفت کلام ہے جسکا حال مواقف

میں بیان کیا ہے۔ ’’ الکلام النفسی غیر العلم اذقد یخبر الرجل ھمالا یعلمہ بل یعلم خلافہ اویشک فیہ وغیر الارادۃ اذقد یا مر بمالا یر یدہ کاالمختبر ’’ لعبدہ ھل یطیعہ ام لا وکا لمعتذرمن ضرب عبدہ لعصیسا نہ فانہ قد یا مرہ ویر دان لا یفعل المامور بہ فاذن ھو صفۃ ثالثۃ قائمۃ بالنفس ‘‘۔اس سے ثابت ہے کہ کلام نفسی ایک جداگانہ صفت ہے اور چونکہ کسی کی تکذیب یا تصدیق کرنا نفس کا فعل ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ نفس کی صفت اور فعل ہے جیسے بعض علماء کا قول جو شرعی مقاصد میں منقول ہے اُسکا مصدق ہے امام موفقؒ نے مناقب ابی حنیفہؒ میں بسند متصل امام صاحب سے روایت کیا ہے ’’قال ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فامامن صدق اللہ وبماجاء من عند ہ بقلبہ ولسانہ فھو عنداللہ و عندالناس مومن‘‘ یعنی امام صاحب فرماتے ہیں کہ جس نے دل سے اور زبان سے تصدیق کی اللہ کی اور اُن چیزوں کی جو اُس کے پاس سے آئی ہیں وہ اللہ کے پاس بھی مومن اور لوگوں کے پاس بھی۔اس سے ظاہر ہے کہ جس کلام کی تصدیق زبان سے ہو دل سے بھی ہونی چاہیے کہ وہ سچ اور مطابق واقع کے ہے۔علامہ ابن ہمامؒ نے مسامرہ میں لکھا ہے کہ لا ظھـــــران

التصديق قول للنفس النا شی عن المعرقه لا ن المفهوم منه لغة نسبة الصدق الی القائل وهوفعل و المعر فة من قبيل الكيف المقابل لمقوله الفعل۔

بہر حال تصدیق شرعی میں فعل قلبی معتبر ہے قصر السبیل میں اس مسئلہ میں ایک مبسوط بحث کر کے لکھا ہے کہ تصدیق شرعی میں دس چیزیں ہوتی ہیں پانچ مقولہ کیف سے ہیں اور باقی مختلف مقولوں سے۔ مقولہ کیف والے یہ ہیں۔

(۱) نور جو دل میں اِس غرض سے ڈالا جاتا ہے کہ چشم بصیرت پر حقایق اشیاء منکشف ہوں۔

(۲) صورت اُس نسبت معلومہ کی جو موضوع و محمول کے بیچ میں ہوتی ہے۔

(۳) استعداد اُس نسبت کے اذعان کی۔

(۴) نفس اذعان۔

(۵) کلام نفسی۔

مقولہ نسبت سے متعلق یہ تین ہیں

(۱) حصول صورت معلومہ کا نفس میں۔

(۲) ابنساط نور کا صورت معلومہ پر۔

(۳) رویت بصیرت اُس صورت کی وجہ سے جب انبساط نور کا اُس پر ہوتا ہے اور یہی علم ہے۔

اور مقولہ انفعال سے ایک ہے وہ متنقش ہونا اُس صورت کا جو مبداء فیاض سے ڈالی جاتی ہے۔

اور مقولہ فعل سے ایک ہے وہ نفس کا یہ کہنا کہ جو صورت اُس میں متنقش ہوئی ہے وہ مطابق واقع کے ہے۔ اور یہی تصدیق لغوی ہے۔ جسکو حکم بھی کہتے ہیں اور باقی امور ضروریات ولوازم ہیں۔

اگرچہ اُن امور میں تقدم و تاخر ہے۔ مگر ذاتی ہے اسلئے کہ جو زمانہ انتقاش صورت کا ہے وہی اُسکے حصول اور ابنساط نور اور رویت بصیرت کا ہے۔

اِس تقریر میں نور کی جو زیادتی کی گئی ہے اُسکا منشاء یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ فَھُوَعَلٰی نُوْرٍمِّنْ رَّبِّہٖ۔ انتھیٰ

توضیح اس مضمون کی یہ ہے کہ جملہ خبریہ ہو جسکی دین میں تصدیق کی

ضرورت ہے مثلاً یہ کہ آنحضرت ﷺ اللہ کے رسول ہیں ۔ اِسکی صورت ذِہن میں منتقش ہوتی ہے جس کی تعبیر موضوع ومحمول ونسبت حکمیہ سے کیجاتی ہے پھر دلائل وقرائن خارجیہ مثلاً معجزات وغیرہ اسباب سے ادراک ہوتا ہے کہ وہ نسبت رسالت جو حضرت ﷺ کی طرف کی گئی ہے واقعی مطابق واقع کے ہے اگر یہ ادراک اِس درجہ کا ہو کہ اُس میں کوئی تردد وشک باقی نہ ہو اُسکا نام یقین ہے اِسکے پیدا ہونے کی یہ صورت ہے کہ ایک نور حسب قابلیت دل میں ڈالا جاتا ہے جسکی وجہ سے چشم بصیرت پر معانی ذہنیہ منکشف ہوتے ہیں۔

جیسا آیہ موصوفہ سے ثابت ہے ۔ مگر قابلیت ہر شخص کی ایک طور پر نہیں چنانچہ یہ امر مشاہد ہے کہ ایک ہی دلیل ہوتی ہے جسکو ایک شخص فوراً قبول کرلیتا ہے اور دوسرے کے لئے وہ بالکل مفید نہیں ہوتی ۔ پھر اختلاف طبائع قطع نظر اسکے کہ طبیعت کی ساخت جداگانہ ہوتی ہے اسباب خارجیہ سے بھی پیدا ہوتا ہے ۔ مثلاً ایک شخص ایسا ہو کہ نشو ونما اُسکی اہل اسلام میں ہوئی ہو اور ہمیشہ اپنے بزرگوں اور معتمد علیہ لوگوں کو طریقہ اسلام پر قایم اور اُسکے مداح دیکھا کیا اگر کوئی اُس سے دینی مسئلہ کہا جائے تو فوراً مان لے گا بخلاف اِسکے جسکی نشو ونما مخالفین اسلام میں ہوئی ہو ۔ جو ہمیشہ اُسکے

ولایت وعقائد کی توہین کرتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ جس مسئلہ کو شخص سابق نے بغیر دلیل کے مان لیا تھا اِس شخص کو دلیل قایم ہونے کے بعد بھی ماننا مشکل ہوگا اسی طرح مخالف صحبت کا بھی بُرا اثر ہوتا ہے اِسی وجہ سے حق تعالیٰ نے متعدد مقامات میں کفار اور منافقوں کی صحبت اور دوستی سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ ''فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوضُوا فِي حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ''۔ اور اکثر احادیث سے ثابت ہے اہل بدعت کی مصاحبت وہم نشینی سے احتراز ضروری ہے غرض کہ جس طرح کسی مسئلہ کو ابتداء ماننا دشوار ہے اسی طرح اُنکی صحبت سے مانے ہوئے مسائل میں بھی شک پڑجاتا ہے جس سے یقین باقی نہیں رہتا اور یقین کے ساتھ ایمان اور تصدیق شرعی بھی رخصت ہوجاتے ہیں نعوذباللہ من ذلک۔

کلام اِس میں تھا کہ ادراک مذکور اگر اس درجہ کا ہو کہ اُسمیں کوئی تردود شک نہ ہوتو اُسکا نام یقین ہے جو مدار ایمان وتصدیق شرعی ہے۔ اور اگر ایسا یقین نہ ہو بلکہ ظن غالب اُسکی واقعیت کا ہوتو شرعاً اُسکو نہ تصدیق کہیں گے نہ ایمان۔ ''قال اللہ تعالیٰ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا وَقال تعالی الا من اکرہ و قلبہ مطمن بالایمان''۔ اگر اکراہ کی

حالت میں کوئی کفر کی بات کہدے تو مضائقہ نہیں بشرطیکہ دل مطمئن اور ساکن ہو کیونکہ اطمینان سکون کو کہتے ہیں۔

”کما فی لسان العرب الطما نیۃ السکون“ ۔اورظاہر ہے کہ سکون اُسی وقت ہوگا کہ یقین باقی رہے اسلئے کہ شک میں تردد اور پریشانی رہتی ہے جو منافی سکون ہے۔

پھر یقین کے بعد اذعان کی بھی ضرورت ہے وہ ایک کیفیت قلبی کا نام ہے جس سے نسبت خبریہ کے قبول کرنے کی صلاحیت دل میں پیدا ہوتی ہے اور جو صعوبت کہ اُس کے قبول کرنے میں ہو دفع ہوجاتی ہے۔اس آیہ شریفہ میں اسی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے ”ثم تلین جلودھم الی ذکراللہ“ کیونکہ تسلیم واذعان کے وقت جو دل میں کیفیت پیدا ہوتی ہے اگر محسوسات میں دکھلانا چاہیں تو اُسکو نرمی پانے کے ساتھ تعبیر کرسکتے ہیں ۔پھر قوت دلائل وقرائن کی وجہ سے اگر کیفیت اذعانی بھی پیدا ہوجائے تو جب بھی تصدیق شرعی نہیں جیسا کہ اِس آیہ شریف سے ظاہر ہے۔” فَلَمَّا جَاءَ تْھُمْ اٰیٰاتُنَا مُبْصِرَۃً قَالُوْا ھٰذَاسِحْرٌ مُّبِیْنَ وَجَحَدُوْا بِھَا وَاسْتَیْقَنَتْھَا اَنْفُسُھُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا “یعنی باوجودیکہ نشانیاں دیکھتے ہیں اور اُنکے نفس یقین بھی کرلیتے ہیں مگر وہ جحود وانکار ہی کئے جاتے ہیں

اِس لئے معلوم ہوا کے صرف یقین شرعی نہیں بلکہ تصدیق شرعی یہ ہے کہ یقین کے بعد زبان سے اور دل سے یہ بھی کہا جائے کہ محمد ﷺ واقع میں اللہ کے رسول ﷺ ہیں اور جو کچھ اللہ کی طرف سے ہمیں پہونچا ہے واقع میں سچ ہے۔

مَعرِفت۔ معرفت ضد نکارت و جہالت ہے اور جب تک تصدیق نہ ہو فقط معرفت سے ایمان متحقق نہیں ہوسکتا۔ ملا علی قاریؒ نے شرح فقہ اکبر میں امام اعظمؒ کا قول کتاب وصیت سے نقل کیا ہے کہ صرف معرفت ایمان نہیں ہے ۔ ورنہ تمام اہل کتاب کو مومن کہنا پڑے گا حق تعالیٰ منافقوں کی نسبت فرماتا ہے ''وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ لَکَاذِبُوْنَ'' ۔اور اہل کتاب کے باب میں فرماتا ہے ''اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتَابَ یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَ ھُمْ'' ۔جسکا مطلب یہ ہے کہ باوجود اتنی معرفت کے وہ ایمان نہیں لاتے اِس سے ظاہر ہے کہ اہل کتاب کی معرفت بھی ایسی ہے جیسے منافقوں کا اقرار زبانی یعنی دونوں مفید نہیں۔

درمنشور میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لائے۔ عمرؓ نے عبداللہ ابن سلام سے پوچھا کے حق تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ پر آیہ شریفہ ''اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتَابَ یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا

یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَاءَ ھُمۡ ''۔نازل فرمائی یہ معرفت کس قسم کی ہے انہوں نے کہا اے عمرؓ میں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھتے ہی ایسا پہچان لیا جیسے کوئی اپنے لڑکے کو دوسرے لڑکوں میں دیکھ کر بلا تکلف پہچان لیتا ہے بلکہ اُس سے بھی زیادہ عمرؓ نے کہا یہ کسطرح۔کہا کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے رسول ہیں حق تعالیٰ نے اُن کا حال ہماری کتاب یعنی توریت میں بیان فرمادیا ہے اور مجھے معلوم نہیں کہ عورتیں کیا کرتی ہیں۔یعنی لڑکے میں شک ہوسکتا ہے کہ اپنا ہے یا نہیں مگر بعد تعریف الٰہی حضرت ﷺ کی نبوت میں ہرگز شک نہیں ہوسکتا انتہیٰ۔اوراسی قسم کی کئی روایتیں دوسرے اہل کتاب سے اُسی میں منقول ہیں کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور ایمان لائے۔

امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں اِس مقام میں یہ اعتراض لکھا ہے کہ اگر توراۃ وانجیل میں حضرت کے تفصیلی حالات وعلامات موجود تھے کہ فلاں وقت اور فلاں مقام اور فلاں قبیلہ میں حضرت ﷺ مبعوث ہوں گے اور آپکے شخصی علامات بھی اُن میں مذکور ہیں تو چاہیئے تھا کہ مشرق سے مغرب تک کے اہل کتاب ایمان لاتے اور بعد اس قدر تفصیلی معرفت کے ممکن نہیں کہ کوئی انکار کرسکتا۔اور اسقدر تفصیل ان کتابوں میں نہیں ہے تو ایسے وقت جس پر ''کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَاءَ ھُمۡ'' صادق آئے خارج از قیاس ہے۔اسکا جو

اب یہ دیا کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ کتابوں کی وجہ سے انہیں یہ معرفت حاصل ہوئی تھی بلکہ دعوی نبوت کیساتھ معجزات نے برہان کا کام دیا تھا اور قاعدہ ہے کہ برہان مفید یقین ہوا کرتی ہے اس لئے ان کو معرفت تامہ الٰہی حاصل ہوگی تھی جیسے اولاد کی ہوتی ہے ہر چند امامؒ نے جو جواب دیا ہے کہ عقلی طور سے نہایت قوی ہے اور اسکی تائید ابوجہل کے قول سے بھی ہوتی ہے جو اوپر مذکور ہوا کہ **نعلمان محمدا** صلی اللہ علیہ وسلم **نبی لکن لانومن بہ** مگر اسکا بھی انکار ہو نہیں سکتا کہ اہل کتاب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علامات و آثار کا علم نسلاً بعد نسل چلا آتا تھا اور اُسکی تطبیق کر کے وہ بحسب ہدایت ازلی اکثر ایمان لاتے تھے چنانچہ خصائص کبریٰ میں امام سیوطیؒ نے اِن روایات کو کئی اوراق بلکہ اجزاء میں ذکر کیا ہے اُن میں وہ علامات جنکی خبریں خصرت ابراہیم و موسیٰ و عیسی علیہم السلام نے دی تھی اور توارات وانجیل وغیرہ کتب آسمانی میں مذکور ہیں مفصل منقول ہیں۔ اور نیز اُن روایات میں بھی مصرح ہے کہ یہودی و نصاریٰ کے علماء حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ حتیٰ کہ قدو قامت اور خط وخال اور عادات وخصال اور پیدا ہونے کا مقام اور مبعوث ہونے کا وقت اور ہجرت کا زمانہ وغیرہ پوری طور سے جانتے تھے چنانچہ جس روز حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اسی صبح کو مدینہ کے گردونواح کے بعض علماء یہود نے اپنی قوم کو جمع کر کے

خبر دی کہ آج نبی آخر الزماں ﷺ پیدا ہوگئے ۔ ایوان کسری کے چودہ کنگرے اسی روز گرے فارس کے آتشکدے جو مدتوں سے سلگے ہوئے تھے یکبارگی بجھ گئے ولادت شریف اور بعثت کے وقت کاہنوں اور ہاتفوں کے اخبار ہر طرف مشہور ہو رہے تھے بعض عرب دین حق کی تلاش میں جو پھرتے تھے اُنکو علماء یہود و نصاری نے صاف کہدیا کہ تمہاری قوم میں مکہ معظّمہ میں نبی آخر الزماں ﷺ عنقریب مبعوث ہونے والے ہیں اُن کا دین اختیار کرو۔

بخت نصر کے واقعہ کے بعد بہت سے بنی اسرائیل مدینہ طیبہ میں حضرت ﷺ کے انتظار میں اقامت گزیں تھے چونکہ خصائص کبریٰ چھپ گئی ہے اسلئے بخوف تطویل وہ روایتیں نقل نہیں کی گئیں۔

غرضکہ علامات حضرت ﷺ کے اِس قدر کثرت سے مشہور اور معلوم ہو چکے تھے کہ علماء یہود و نصاری دیکھتے ہی حضرت ﷺ کو پہچان لیتے اور جن امور میں امتحان کی ضرورت ہوتی بعد امتحان ایمان لاتے پھر صرف حضرت ﷺ ہی کے علامات یہود میں شایع نہ تھے بلکہ حضرت ؐ کی امت کے علامات و خصوصیات اور بعض مختصہ مسائل اسلام کو بھی جانتے تھے یہاں تک مروی ہے کہ قبل بعثت صدیق اکبرؓ شام کی طرف گئے تھے ایک راہب نے علامات ظاہری دیکھ کر آپ سے کہا کہ سب علامات تو میں دیکھ

چکا ہوں آپ اپنے پیٹ پر سے کپڑا اٹھایئے چنانچہ خال دیکھ کر کہا کہ نبی آخرالزمان ﷺ عنقریب مبعوث ہونے والے ہیں آپ اُنکے وزیر و خلیفہ ہوں گے۔ اسی طرح عمرؓ کا بھی واقعہ ہے کہ بعض راہبوں نے علامات دیکھ کر اسی قسم کی خبریں دیں غرض اس قسم کی روایتیں کتب احادیث و سیر میں بکثرت وارد ہیں۔ اتنے علامات مشہور ہونے کے بعد یہ امر قابل استبعاد نہیں کہ اہل کتاب کو آنحضرت ﷺ کی معرفت اُنکے علوم سابقہ سے ہوئی ہو جس پر معجزات نے 'نورٌ علیٰ نور' کا کام دیا اس سے ظاہر ہے کہ اہل کتاب کی معرفت اُنکے ذاتی علوم سے تھی اُس میں معجزات کو چنداں دخل نہیں ورنہ اہل کتاب کی کیا خصوصیت معجزات تو مشرکین بھی دیکھتے تھے۔ رہا یہ کہ پھر سب اہل کتاب مسلمان کیوں نہیں ہوے۔

اسکا جواب یہ ہے کہ معجزات دیکھنے کے بعد بھی تو مسلمان نہیں ہوئے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ علامات مختصہ مفید علم نہ ہوں بلکہ ایمان نہ لانا حسد و استکبار وغیرہ اسباب سے تھا جسکا حال اوپر معلوم ہوا اور ابوجہل کے قول مذکور سے بھی ثابت ہے بہر حال خواہ معجزات کی وجہ سے ہو یا کتب سماوی کی وجہ سے اہل کتاب کو بلکہ دوسرے کفار کو بھی حضرت ﷺ کی معرفت اور نبوت کا علم ضرور تھا لیکن تصدیق ہونے کی وجہ سے بجاے

اسکے کہ وہ مفید ہو وبال جان ہوئی مقصود یہ ہے کہ صرف معرفت بغیر تصدیق کے مفید نہیں ہوسکتی۔ اب یہ دیکھنا چاہئے کہ تصدیق شرعی کے ساتھ معرفت کی بھی ضرورت ہے یا نہیں ہم جب معرفت کے معنی میں غور کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تصدیق بغیر معرفت کے نہیں ہوسکتی اسلئے کہ خدائے تعالیٰ کو مثلاً کوئی نجانے یا صرف اسقدر جان لے کہ کوئی چیز ہے اور صفات مختصہ کو جس سے امتیاز و تعین حاصل ہو نہ جانے تو تصدیق ہی کیا ہوئی ہاں اس میں شک نہیں کہ حق تعالیٰ کی ذات کی معرفت حاصل نہیں ہوسکتی مگر صفات کی معرفت بقدر طاقت بشری ضروری ہے کچھ نہیں تو اتنا تو جاننا ضرور ہے کہ وہ قدیم ہے سب کا خالق ہے اور اسکے مثل کوئی چیز نہیں۔ نہ اُسکا کوئی شریک ہے نہ مقابل اسلئے بن دیکھے ایمان لا رہے ہیں اسکی تعیین ہوجائے تاکہ دوسرا کوئی اُس ایمان میں شریک نہ ہو۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کی تعیین بھی ایمان میں ضرور ہے۔

علامہ زرقانی نے شرح مواہب الدنیہ میں لکھا ہے ''روی ابن ابی عاصم فی السنة وابو نعیم عن انس رضی اللہ عنہ ان اللہ قال یا موسیٰ من لقبنی وھو جاھل بمحمد ﷺ ادخله النار فقال موسی ومن محمد ﷺ قال یا موسی وعزتی وجلالی ماخلقت خلقا اکرم

علی منہ کتبۃ اسمہ مع اسمی علی العرش قبل ان اخلق السموات والشمس والقمر بالفے الف سنہ ''انتھی یعنی حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ اے موسیٰؑ جو مجھ سے ملے اور محمد ﷺ کو نہ جانے اُسکو آگ میں ڈالوں گا موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی کہ محمد ﷺ کون ہیں۔ فرمایا قسم ہے میری عزت وجلال کی ان سے بزرگ تر کسی کو میں نے نہیں پیدا کیا اُنکا نام اپنے نام کے ساتھ بیس لاکھ برس آسمان وزمین وشمس وقمر پیدا کرنے کے پیشتر لکھا انتھیٰ۔

اِس سے ظاہر ہے کہ آنخضرت ﷺ سے جاہل رہنا موجب دخول نار ہے اِسلئے اُسکی ضد یعنی معرفت ضروری ہے۔ اِسی وجہ سے امام اعظمؒ نے فرمایا ہے کہ ''الایمان المعرفت والتصدیق والاقرار ''(کذافی المناقب للموفقؒ) ابن ہمامؒ نے ''مسامرہ'' میں لکھا ہے کہ امام ابوالحسن اشعریؒ کا قول معنی تصدیق میں متردد ہے کبھی کہتے ہیں کہ وہ خدائے تعالیٰ کے وجود والٰہیۃ وقدم کی معرفت کا نام ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ وہ نفس کا قول ہے لیکن متضمن معرفت ہے جسکے بغیر تصدیق صحیح نہیں عرض اُنکے کلام میں دواحتمال ہیں ایک معرفت کا شرط تصدیق ہونا دوسرا یہ کہ تصدیق معرفت اور کلام نفسی کے مجموعہ کا نام ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ معرفت تصدیق سے

خارج اوراُسکے لئے شرط ہے اسلئے کہ لغت میں تصدیق صرف سچائی کو کہتے ہیں اگر معرفت بھی اسمیں داخل کردی جائے تو اس لفظ کا منقول شرعی ہونا لازم آئیگا حالانکہ منقول سمجھنے کے لئے کوئی دلیل چاہئے اور کوئی دلیل اُس پر قائم نہیں بلکہ قرآن وحدیث میں جہاں یہ لفظ مستعمل ہے معنی لغوی ہی میں مستعمل ہے الحاصل معرفت گوداخل ایمان نہیں مگر شرط ایمان ضرور ہے انتہیٰ یہاں یہ بات بھی معلوم کرنی ضرور ہیکہ معرفت کے مدارج مختلف ہیں عموماً اہل اسلام اجمالاً اسقدر جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ خالق اور متصف بہ صفات کمالیہ ہے پھر جس قدر آثار قدرت وغیرہ صفات کمالیہ میں غورو تامل کیا جائے اسی قدر معرفت کی زیادتی ہوئی ہےاور جس قدر معرفت کی زیادتی ہومحبت زائد ہوتی ہے وہ باعث ترقی مدارج قرب ہے۔

امام غزالیؒ نے احیاء میں توضیح کے لئے یہ مثال لکھی ہے کہ مثلاً امام شافعیؒ کی محبت کل شافعیوں کو ہےاورسب اُن کو عالم جانتے ہیں لیکن فقہائے شافعیہ کو ہر مسئلہ کے دقائق استدلال معلوم کرنے کے بعد جو قدرومحبت امام کی ہوتی ہے وہ عام شخص کونہیں ہوسکتی اسی طرح جب کوئی کسی مصنف کی عمدہ تصنیف یاکسی شاعر کا بلیغ قصیدہ دیکھتاہے تو اُس سے ایک قسم کی محبت ہوتی ہے پھراور بھی اُسکی عمدہ تصانیف وقصائد دیکھے اورغور

وتامل سے اُسکی جلالت وشان معلوم کرے تو اُسکو جو محبت اور قدر اُسکی ہوگی وہ اس شخص کو نہیں ہوسکتی جو اُسکو صرف ایک عالم یا شاعر جانتا ہے غرض آدمی جس قدر مصنوعات الٰہی میں زیادہ تر غور وفکر کرے اور خدائے تعالیٰ کی جو جو نعمتیں اور احسانات تمام عالم پر خصوصاً اپنے پر ہورہے ہیں اُنکو سوچے تو محبت زیادہ ہوگی اسی سبب سے صفات الٰہی میں غور وفکر کرنے کے فضائل احادیث میں بکثرت وارد ہیں منشاء اُسکا یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر معرفت زیادہ ہوگی اُسی قدر محبت زیادہ ہوگی چونکہ خدا اور رسول کی محبت کا زیادہ ہونا دین میں ایک ضروری امر ہے اور ظاہراً اُسکے حاصل کرنے کا ذریعہ معرفت ہے اسلئے اکابر اہل اسلام ہمیشہ زیادتی معرفت الٰہی کے طالب اور اُس میں مستغرق رہا کرتے ہیں۔ الحاصل بندہ کو خدا کی معرفت اور امتی کو نبی ﷺ کی معرفت حاصل کرنیکی ضرورت ہے۔

یہ امر قابل تسلیم ہے کہ معرفت ذات کو مقاصد دینیہ میں دخل کی یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات میں فکر کرنے کی ممانعت ہے جیسا کہ حدیث شریف سے صراحتاً ثابت ہے اور دراصل ذاتِ الٰہیہ کا ادراک ممکن بھی نہیں اس لئے کہ خدائے تعالی اور نبی کریم ﷺ کے اُن صفات کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے جو دوسروں میں نہ پائی جائیں اور ظاہر ہے کہ جو

صفات سوائے خدائے تعالیٰ کے اور کسی میں نہیں پائے جاتے وہ ایسے ہی ہونگے جوان میں غور و تامل کرنے سے عظمت و شان کبریائی دل میں متمکن ہوتی جائے گی پھر جس خاص صفت میں اتنا غور و تامل کیا جائے کہ استغراق کی سی حالت پیدا ہو تو اُسکے مناسب دل کی کیفیت میں تغیر پیدا ہوا کرے گا مثلاً صفت قہاری کے مطالعہ کے وقت دل میں خوف و حشت کی کیفیت پیدا ہوگی اور صفت جمال و رحمانیت کے مراقبہ سے محبت و عشق علیٰ ہذا القیاس ہر صفت کا جدا جدا اثر ہوگا۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صفات مختصہ میں غور و فکر کرنے سے دل میں مختلف آثار پیدا ہوتے جائیں گے اسی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات مختلف تھے جن کی طبیعتوں پر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا پورا اثر تھا اُنہوں نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کو آنکھ بھر کے کبھی نہیں دیکھا جیسا کہ شفا میں قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں باوجودیکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مجھے کسی سے محبت نہ تھی مگر مجھ سے کبھی نہ ہو سکا کہ آنکھ بھر کے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کو دیکھوں اور اکثر روایات سے ثابت ہے کہ صحابہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو ایسے سر جھکائے آئے بیٹھتے تھے کہ گویا اُن کے سر پر پرندے بیٹھے ہیں کہ ادنیٰ حرکت سے اُڑ جاتے ہیں۔ اور ایک صحابی کا حال شفا

میں لکھا ہے کہ جب تک وہ حضرت ﷺ کی مجلس میں حاضر رہتے چہرہ مبارک ہی کو دیکھتے رہتے حضرت ﷺ نے اُسکی وجہ دریافت کی عرض کی میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں دیدار فائض الانوار سے متمتع اور بہرہ یاب رہتا ہوں شفا میں لکھا ہے کہ حضرت جب وضو فرماتے یا تھوکتے یا ناک چھڑکتے تو صحابہ کا اُس پر ہجوم ہوتا اور ہاتھوں ہاتھ آبِ وہاں وبنی وغیرہ کو لیکر اپنے منہ اور جسم پر ملتے اور اگر کوئی موئے مبارک ملجاتا تو فوراً اُٹھا کر تبرک بناتے مخالفین یہ دیکھ کر یہ کہتے کہ ہمنے بڑے بڑے سلاطین مثل قیصر وکسریٰ دیکھے ہیں مگر کسی بادشاہ کو یہ نصیب نہیں جو حضرت ﷺ کو ہے خصائص کبریٰ میں ہے کہ ایک بار عبداللہ بن زبیرؓ حضرت ﷺ کی خدمت میں ایسے وقت حاضر ہوئے کہ حضرت ؐ پچھنے لگوارہے تھے فارغ ہونے کے بعد آپ نے فرمایا کہ یہ خون ایسی جگہ پھینک دو جہاں کوئی نہ دیکھے انہوں نے لیجا کر سب خون پی لیا جب واپس آئے تو حضرت ﷺ کے استفسار پر انہوں نے عرض کی کہ میں نے اس کو اسی جگہ ڈالا ہے کہ کوئی نہ دیکھ سکے فرمایا کہ شاید تم اس کو پی گئے اور اسی میں یہ روایت بھی ہے کہ ایک رات آنحضرت ﷺ نے کسی ظرف میں پیشاب کی ام ایمن رضؓ کہتی ہیں کہ میں نے اُسکو پی لیا جب صبح حضرت ﷺ کو اُسکی خبر دی تبسم کر کے

فرمایا کہ تمہارے پیٹ میں اب کبھی کوئی شکایت نہ ہوگی اِن امور پر غور کرنے سے ایک حیرانی ہوتی ہے کہ نہ انکا منشا محبت معلوم ہوتا ہے نہ عظمت ورنہ مقربین سلاطین میں اِس قسم کے حالات پائے جاتے۔ بات یہ ہے کہ کاملوں کے حالات ہم ناقصوں کی سمجھ میں کیونکر آسکیں اگر حق تعالےٰ اپنے کرم وفضل سے ہمیں بھی وہ حالات عطافرمائے تو ممکن ہے کہ اُسکی حقیقت معلوم کرسکیں ورنہ

چہ نسبت خاک رابا عالم پاک

دراصل یہ جتنے آثار تھے سب کا منشا وہی معرفت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصوصیات کو خوب جانتے تھے کہ آپ کا کوئی نظیر عالم میں نہیں اور آپ کو حق تعالیٰ کے ساتھ ایک ایسی خصوصیت ہے جو دوسرے کو نہیں ہوسکتی وہ سمجھتے تھے کہ جس قدر محبت اور عظمت کے آثار صادر ہوں سب باعث تقرب الٰہی ہیں بلکہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور تعظیم کو خدائے تعالیٰ کی محبت اور تعظیم سمجھتے تھے ہر چند اس وقت صحابہؓ کی سی معرفت حاصل ہونا ممکن نہیں اسلئے کہ ان کو مشاہدات سے وہ معرفت حاصل ہوئی تھی جن کا وجود اب ممکن نہیں مگر اتنا مسلمانوں کو ضرور ہے کہ ایمانی طریقہ سے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت حاصل کرنے میں کوشش کریں اور کیا تعجب کہ

شدہ شدہ اِس کی برکت سے اِس قسم کا فیضان ہونے لگے جو صحابہؓ پر ہوتا تھا۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد   بسا کیں دولت از گفتار خیزد

خدااور رسول ﷺ کی محبت

اِس حدیث شریف سے ظاہر ہے جو بخاری شریف میں ہے کہ ایک بار آنحضرت ﷺ عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ہاتھ ملائے ہوئے تھے حضرت عمرؓ نے کمال جوش محبت میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ قسم خدا کی میں آپ کو سوائے اپنی ذات کے ہر چیز سے زیادہ دوست رکھتا ہوں ارشاد ہوا کہ جب تک میری محبت اپنی ذات سے کسی کو زیادہ نہ ہو اُسکو ایمان ہی نہیں حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ قسم ہے خدا کی جس نے آپ پر کتاب نازل کی میں آپ کو اپنی ذات سے بھی زیادہ تر محبوب رکھتا ہوں فرمایا الآن یا عمرؓ یعنی اب تمہارا ایمان پورا ہوا۔ اگر چہ اس حدیث شریف میں صرف آنحضرت ﷺ کی محبت کا ذکر ہے مگر چونکہ حضرت ﷺ کی محبت کا منشاء حق تعالیٰ کی محبت ہے اس لئے یہی حدیث دونوں محبتوں کے استدلال میں کافی ہوسکتی ہے۔

ابن تیمیہ نے ’’الصارم المسلول ‘‘میں بعض حقوق خدااور رسول

اللہ ﷺ کے بیان کر کے لکھا ہے وفی ھذو غیرہ بیان لتلازم الحقین واللہ جھۃ اللہ تعالیٰ ورسولہ جھۃ واحدۃ غرض اِس حدیث شریف سے ظاہر ہے کہ اہل اسلام حضرت ﷺ کی محبت بڑہانے پر مامور و مجبور ہیں کیونکہ حضرت عمرؓ نے ابتداء میں جس مقدار محبت کی خبر دی تھی وہ کافی نہیں سمجھی گئی اسلئے انہوں اختیار سے اپنے نفس پر جبر کر کے جو کسر باقی تھی نکالدی۔

یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ محبت ایک کیفیت قلبی ہے اُس پر زیادتی و کمی اختیار سے کیونکر ہوسکتی ہے کیونکہ اندرونی کیفیات پر تو آدمی کا تصرف ہی نہیں چل سکتا مثلاً بھوکا اگر چاہے کہ بغیر سبب خارجی کے بھوک جاتی رہے تو ممکن نہیں اور صرف زیادتی و کمی کی خواہش کو یا طبیعت پر جبر کرنے سے موجودہ بھوک کے وجدان میں فرق نہ آئے گا جب تک اُس کے کم یا زیادہ ہونے کے اسباب خارج سے نہ پیدا گئے جائیں مثلاً کچھ کھالینے سے کم اور نہ کھانے سے زیادہ ہوجائیگی۔

مواہب لدینہ میں علامہ قسطلانیؒ نے خطائی کا قول نقل کیا ہے کہ یہاں مقصود حبِ اختیاری ہے جب طبعی نہیں جو اختیار سے خارج ہے۔ علامہ زرقانیؒ نے اُسکی شرح میں لکھا ہے کہ حبِ اختیاری مقتضائے عقل ہوتی ہے

گو خلاف طبع ہو جیسے بیمار دوا کو دوست رکھتا ہے اگرچہ کڑوی ار مخالف طبع ہو۔اور مواہب میں امام نوویؒ کا قول نقل کیا ہے کہ مقصود یہاں یہ ہے کہ نفس معمئنہ کو نفس امارہ پر غالب کردی جائے جس سے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت تمام اشیا سے بلکہ اپنے نفس سے بھی زیادہ ہوجائے گی اور نفس امارہ کا غلبہ ہوتو یہ ممکن نہیں اوراسی میں لکھا ہے کہ قاضی عیاضؒ نے ایمان میں محبت شرط ہونیکی یہ وجہ لکھی ہے کہ محبت لازمہء عظمت ہے یعنی جس کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ہوگی اُسکو محبت بھی ہوگی اور محبت نہ ہونے سے سمجھا جائے گا کہ اسکے دل میں عظمت نہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت دل میں نہ ہونا کفر ہے۔مگر اُس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اعتقاد عظمت کو محبت لازم نہیں حضرت عمرؓ کے دل میں جس قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت تھی ظاہر ہے باوجود اسکے انہوں نے ابتدا میں اپنی ذات کی محبت پر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو فوقیت نہیں دی۔

اور لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے پہلی بار حب طبعی کی خبر دی تھی جو اپنے نفس کے ساتھ تھی اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود یہ تھا کہ حب اختیاری کی ضرورت ہے چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا کہ دلائل اپنے دل میں قائم کرکے فوراً ترجیح محبت کی خبر دی۔انتہی

اسمیں شک نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو ایمان سے بڑا ہی تعلق ہے

اِس لئے کہ بہت سے آیات واحادیث ایسے ہیں کہ اُن پر کامل ایمان ہوتو محبت کی زیادتی ضرور ہوگی مثلاً آیہ شریفہ **وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ** اگر آدمی اسی میں غور کرے اور اس کو یقین ہوجائے کہ آنخضرت ﷺ ہمہ تن رحمت الٰہی ہیں تو اُسکو ضرور آپ سے دلی محبت ہوگی کیونکہ یہ امر آدمی کی فطرت میں داخل ہے کہ جب کسی ذی رتبہ شخص کا حال سنتا ہے کہ وہ رحم دل ہے اور اُس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے تو اِس سے دلی محبت پیدا ہوتی ہے اور جوں جوں اُسکے رحم اور فائدہ رسانی کے واقعات سنتا ہے محبت میں ترقی ہوتی ہے اسی کو دیکھ لیجئے کہ حاتم طائی کے واقعات سننے سے وجدانی طور پر دل میں اُس سے محبت محسوس ہوتی ہے بخلاف اُسکے حجاج اور چنگیز خاں سے دشمنی کی کیفیت پائی جاتی ہے حالانکہ اس وقت نہ حاتم سے نفع کی توقع ہے نہ اُن سے ضرر کا اندیشہ۔ بخلاف اسکے آنخضرت ﷺ کے وجود باجود سے تو بے انتہا فوائد ہمیں حاصل ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں اور آئندہ کے لئے بے شمار منافع کی امیدیں ہیں کیونکہ حضرت ﷺ کا رحمت للعالمیں ہونا اسوقت تک محدود نہ تھا کہ آپ اِس عالم میں تشریف رکھتے تھے بلکہ قیامت کے روز اُس رحمت عامہ کا ایسے طور پر ظہور ہوگا کہ تمام عالم اُسکو مشاہدہ کرلے گا۔ اگر عالمین میں کفار بھی داخل ہیں مگر ہمیں

اس جگہ جھگڑے سے کیا کام کہ اُن کو اُس رحمت عامہ سے حصّہ ملے گا یا نہ ملے گا دشمنان خدا ورسول ﷺ جہنم میں جائیں ہمیں اپنی مشت خاک بخشوانے کی پڑی ہے اگر ہماری بخشش بطفیل محبت رحمۃ للعالمین ہوگئی تو ہم جیسا کوئی خوش نصیب نہیں حق تعالیٰ نے آپ سے وعدہ فرمایا ہے ’’ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ‘‘ اور فرماتے ہیں یعنی البتہ قریب میں تمہارا رب تمہیں اتنا کچھ دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے جس شخص کو قیامت کے روز اور اُس میں جو جو وقائع پیش آنے والے ہیں اُن پر پورا ایمان ہو تو صرف اِسی ایک آیت اور حدیث پر ایمان لا کر دیکھ لے کہ حضرت ﷺ کی محبت اپنی جان سے زیادہ ہوتی ہے یا نہیں مگر اس کا خیال رہے کہ ایمان وہ ہونا چاہئے جسکا حال اوپر معلوم ہوا اگر اُن مضامین کا ذہول ہو گیا ہو تو پھر ایک نظر اُس پر ڈال لیجائے تا کہ حقیقت ایمان پیش نظر اور متحقق ہو جاوے صحیح صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ قیامت کے روز شان قہاری اور غضب الٰہی کا ظہور ایک ایسی غیر معمولی طور پر ہوگا کہ اُسکے پہلے کبھی ہوا تھا اور نہ بعد ہوگا دیکھئے پہلے تو خدا کا غضب الامان اُس پر غضب بھی کیسا کہ ازل سے اُس وقت تک ویسا ہوا ہی نہیں۔ نہ نوح علیہ السلام کے وقت نہ اور کبھی اور نہ اُسکے بعد ہوگا حالانکہ ابدالا باد غضب الٰہی میں رہیں گے مگر اُس

غضب کے مقابلہ میں جو اُس روز ہوگا یہ غضب بھی کم ہوگا اُس غضب کا تھوڑا سا حال اِس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ انبیا علیہم السلام جنکے مقربین بارگاہ الٰہی ہونے میں ذرا بھی شک نہیں اُس روز نفسی نفسی کہیں گے اور طرفہ یہ ہے کہ خلیل علیہ الصلوۃ والسلام بھی باوجود خلت کے نفسی نفسی فرمادیں گے اب نفسی نفسی کا مطلب کُھلے لفظوں میں سن لیجئے کہ جب جن وانس انبیاء علیہم السلام سے طالب شفاعت ہونگے تو وہ سب بالاتفاق یہ کہیں گے کہ اسوقت غضب الٰہی کو وہ جوش ہے کہ شفاعت تو بڑی چیز ہے ہمیں اسوقت اپنی پڑی ہے کہ نہیں معلوم کہ جو لغزشیں بمقتضائے بشریت ہم سے سرزد ہوئی تھیں اُن کا آج کیا حشر ہوگا۔ اسوقت تمام عالم میں ایک سنّاٹا ہوگا نہ فرشتوں کی مجال کہ کچھ عرض ومعروض کرسکیں نہ انبیا علیہم السلام میں جرائت کہ دم مارسکیں پھر وہ دن بھی کتنا بڑا پچاس ہزار سال کا جسکی خبر خدائے تعالیٰ دیتا ہے ’’تعرج الملئکۃ والروح فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ مما تعدون‘‘ اس روز عرض اعمال اور فیصلہ حقوق ومحاسبہ وغیرہ پچاس کام ہونگے اور ہر کام ہوش ربا اور جاں گداز ہوگا حقوق اللہ کی بازپرس اسطرح کہ عمر بھر کے کل حرکات وسکنات کا دفتر پیش ہے اور بات بات کی پرسش ہورہی ہے کہ خلاف خدا اور رسول ﷺ فلاں کام کیوں کیا اور

فلاں کام کیوں نہ کیا اور فلاں جگہ کیوں بیٹھا اور فلاں شخص سے بات کیوں کی وغیرہ وغیرہ اگر بچاؤ کی غرض سے کسی بات کا انکار کیا تو ہاتھ پاؤں وغیرہ اعضاء گواہی دے رہے ہیں کہ یہ شخص جھوٹا ہے خود ہم سے اُس نے یہ کام لیا تھا'' کما قال اللہ تعالیٰ وَتَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْ يَعْمَلُوْنَ. وقال تعالی حَتّٰى اَذَا مَا جَاؤُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْ يَعْمَلُوْنَ ''یعنی گواہی دیں گے اُن پر اُنکی زبانیں ہاتھ پاؤں کان آنکھیں اور اُنکے چمڑے جو کچھ وہ کرتے تھے۔ اور حقوق الناس کی یہ کیفیت کہ ہر شخص اپنی نجات کی فکر میں لگا ہوا اِس دھن میں ہے کہ کسی طرح گناہوں کا بار سر سے ٹل کے اعمال حسنہ کا نصاب پورا ہو جائے اس غرض سے ادنیٰ ادنیٰ حقوق کے مطالبہ کہ لئے دوست قرابتدار ماں باپ جورو بچے دوڑے چلے آرہے ہیں کہ ہمارے یہ حقوق اسکے ذمہ ہیں دلا دیئے جائیں اور اگر اُس کے پاس حسنات کا اس قدر سرمایہ نہیں تو ہمارے گناہ ہی اس کے سر لگا دیئے جائیں وہ بیچارہ اُن سے بھاگ رہا ہے جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِّيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ یہ لوگ وہ ہیں کہ عمر بھر اُنکے ساتھ احسان کرتے رہے اور اُنکے رنج وراحت میں شریک

رہے اب یہی لوگ دوزخ میں پہونچانے کی فکر میں لگے ہیں اسی پر اُن پچاسوں واقعوں کا قیاس کیجئے جو اُس روز وقوع میں آنے والے ہیں خلاصہ یہ کہ ہر ایک واقعہ جانکاہ و جانگداز ہوگا ادھر یہ پریشانی اُدھر جہنم پیش نظر ہے اور ھل من مزید کے نعرے پر نعرہ لگا رہا ہے اب غور کیجئے کہ ایسی حالت میں کیا جان کوئی عزیز چیز سمجھی جا سکتی ہے ہر گز نہیں ایسی زندگی سے تو مرجانا ہزار درجہ راحت ہی ہوگا اسی وجہ سے کفار آرزو کریں گے کہ کاش ہم مٹی ہوے ہوتے کما قال تعالی وَيَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا اب تمام واقعوں کو پیش نظر رکھ کر غور کیجئے کہ ایسی حالت میں جب رحمۃ للعالمین ﷺ بارگاہ الٰہی میں پیش ہوکر اپنی امت میں سے خصوصاً اُن لوگوں کی شفاعت فرما دیں گے جن کو آپ کے ساتھ محبت ہے اور باجازت کبریائی اُن تمام آفتوں سے نجات دلا کے جنت میں داخل فرما دیں گے تو اب بتائے کہ وہ جان جو معرض تلف میں ہے جسکا نکل جانا بہتر سمجھا جاویگا وہ زیادہ تر محبوب ہونی چاہیئے یا وہ حضرت ﷺ جو اس جان کو ابدالآباد کے بے انتہا مصائب سے بچا کر ابدالآباد کے تلذذات میں پہونچانیوالے ہیں مگر یاد رہے کہ جان سے زیادہ محبت اُسی وقت ہوگی کہ ایمان امور مذکورہ بالا سے کامل طور پر ہو مقصود آنحضرت ﷺ کا اس

حدیث شریف سے یہ تھا کہ کمال ایمان کی شناخت بتلا دیں کہ اگر جان سے زیادہ محبت ہو تو سمجھ جائیں کہ ایمان کامل ہے ورنہ اُسکی تکمیل کی فکر کریں اُس پر بھی اگر کوئی حضرت ﷺ سے محبت نہ رکھے تو حضرت ﷺ کا اس سے کوئی نقصان نہیں اُس نے اپنا ہی نقصان کیا ۔ اور دوسری وجہ ضرورت محبت کی یہ ہے کہ وہ آدمی کی فطرت میں داخل ہے کہ جس سے زیادہ محبت رکھتا ہے اُسکی بات مانتا ہے اور جس کام کے کرنے یا نہ کرنے کو وہ کہتا ہے اُسکی اطاعت کرتا ہے چنانچہ بزرگوں نے لکھا ہے ان الحب لمن یحب یطیع اِسی وجہ سے ہر شخص کو اپنے سچے دوستوں پر وثوق اور اس بات کا افتخار ہوتا ہے کہ ہم اپنے دوستوں سے جو کچھ کہیں گے کیسا ہی وہ مشکل کام ہو اُسکو وہ انجام دیں گے اور وجدانی طور پر دوست کی محبت کا اندازہ کرسکتا ہے کہ اپنے احباب میں کون سچے ولی قابل وثوق دوست ہیں اور کون ریائی اور غرضی ۔ غرض کہ جس نے ساتھ کامل محبت ہوتی ہے اُسکی مخالفت کسی امر میں ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ مخالفت دشمنی کا لازمہ ہے ۔ انتہائی درجہ کی محبت کسی سے ہو تو اُسکے کہے پر جان بھی دینا آسان ہو جاتا ہے ۔ یہ تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ جسکو اپنی بی بی کے ساتھ زیادہ محبت ہوتی ہے تو اُسکے حکم کے مقابل میں اپنے ماں باپ کے حکم کی کچھ پروا نہیں کرتا بلکہ اُنکا

دشمن ہوجاتا ہے حالانکہ اُنکے حقوق اور احسانات ایسے نہیں کہ اُنکا انکار کرسکے مگر اُس محبوبہ کی محبت کا یہ اثر ہے کہ وہ حقوق میں کان لم یکن ہیں ہر چند تقاضائے فطرت انسانی یہ تھا کہ والدین سے دشمنی یا مخالفت نہ ہوسکی مگر محبوبہ کی محبت نے اُس کو آسان کردیا۔ اب غور کیجئے کہ مومن کو کسی کیساتھ اگر اتنی محبت ہو کہ اُسکے حکم کے مقابلہ میں اپنے نبی ﷺ کے حکم کو نہ مانے تو کیونکر کہا جائے کہ اُسکا ایمان کامل ہے اسی طرح اگر نفس کوئی حکم کرے اور نبی ﷺ کا حکم اُسکے خلاف میں ہو تو مومن کا فرض منصبی کیا ہونا چاہئے آیا نفس کا حکم مانے یا نبی ﷺ کا یہ تو کوئی مسلمان نہیں کہہ سکتا کہ نبی ﷺ کا حکم نہ مانے گا مگر جب اپنے نفس کی محبت نبی ﷺ کی محبت سے زیادہ ہوگی تو اکثر نفس ہی کی بات چل جائیگی جس سے نبی ﷺ کی مخالفت اکثر ہوا کرے گی اس لئے حضرت ﷺ نے فرمایا کہ ہر مومن کو ضرور ہے کہ اپنے ماں باپ اولاد اور تمام لوگوں سے بلکہ اپنے نفس سے بھی زیادہ محبت میرے ساتھ رکھے تا کہ حضرت ﷺ کے حکم کے مقابلہ میں کسی کا حکم نہ چلے کیونکہ یہ لوگ جس کام کا حکم کریں گے اُسمیں اُنکو اپنا نفع ذاتی پیش نظر ہوگا اسی طرح نفس بھی اُنہیں کاموں کی خواہش کرے گا جن میں صرف دنیوی تلذذات ہوں بخلاف آنحضرت ﷺ کے کہ آپ کو امر و نہی

سے کوئی اپنا ذاتی نفع متصور نہیں بلکہ جن کاموں کے کرنے کا آپ ﷺ نے حکم فرمایا ہے اُن سے صرف ہماری بڑی بڑی منفعتیں دونوں جہاں کی متعلق اور وابستہ ہیں اور جن کاموں سے منع فرمایا دونوں جہاں میں وہ ہمارے مضر اور مہلک ہیں اِس امر و نہی سے حضرت ﷺ کی غرض یہی ہے کہ ہمیں اُنکے بجالانے سے ابدالآباد کی سعادت اور راحت نصیب ہو اور دارین میں کامیاب رہیں حق تعالیٰ فرماتا ہے ''لَقَدْ جَاءَ کُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْہِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُوْفٌ رَّحِیْمٌ'' یعنی آئے ہیں تم میں رسول ﷺ تم میں کے شاق ور بھاری ہے اُن پر کہ تم ایذا میں پڑو تمہاری بھلائی پر وہ حریص ہیں ایمان والوں پر شفقت اور مہربانی رکھتے ہیں انتہیٰ ۔ حاصل یہ کہ جب کوئی ایسا کام پیش ہو کہ اُس میں اپنے نفس یا اور کسی محبوب کی خواہش ہو اور اُس کام میں نبی ﷺ کی خواہش اُسکے خلاف میں ہو تو مومن کو چاہئے کہ نبی ﷺ کی خواہش کو پورا کرے اور اُنکی خواہش پر خاک ڈالے جو خودغرضی سے اپنے دوست کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ نبی ؐ کی پوری اطاعت اسوقت تک ممکن نہیں کہ اُن سب سے زیادہ محبت آپ ﷺ کے ساتھ ہو اور جب تک امور مذکورہ پر کامل ایمان نہ ہوگا اِس قسم کی محبت حضرت ﷺ سے ہو نہیں سکتی اِس

اُسے ظاہر ہے کہ حضرت ﷺ کی محبت کے ساتھ ایمان کو ایک تعلق خاص ہے غرض حضرت ﷺ نے جو خواہش فرمائی کہ تمام عالم سے زیادہ محبت آپکے ساتھ ہو اُسمیں بھی صرف ہماری بھلائی پیش نظر ہے اب ہمیں ضرور ہے کہ اگر اس قسم کی محبت اپنے میں پائیں تو شکر الٰہی بجالائیں ورنہ دعا کریں کہ الٰہی ہمیں آنحضرت ﷺ کی ایسی محبت عطا فرما کہ آپ کی اطاعت ہم پر آسان ہو جائے اور اُسکے مقابلہ میں ہم سے نہ اپنے نفس کی اطاعت ہو سکے نہ اور کسی محبوب کی اب آنحضرت ﷺ کی اطاعت کا حال سنئے حق تعالیٰ فرماتا ہے ’’قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ‘‘یعنی کہہ دو اے محمد ﷺ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری اتباع کرو جس سے تم اللہ کے محبوب ہو جاؤ گے۔ سبحان اللہ حضرت ﷺ کی اطاعت کیسی باوقعت چیز ہے کہ محبوب الٰہی بنا دیتی ہے۔ دیکھئے یہاں بھی وہی بات ہے جو اوپر مذکور ہوی کہ جسکے ساتھ آدمی محبت رکھتا ہے اُسکی اطاعت کرنا ہے اِسی وجہ سے حق تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو دعوے محبت رکھتے تھے گویا یہ فرمایا کہ اگر تمہیں ہماری محبت ہے تو ضرور ہے کہ اُسکے آثار نمایاں ہونگے یعنی ہماری اطاعت کرو گے اور ہماری اطاعت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرو جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے ومن

یطع الرسول فقد اطاع اللہ یعنی جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی اُس نے یقیناً اللہ کی اطاعت کی۔

یہاں ایک اور بات معلوم ہوئی کہ حق تعالیٰ کو منظور ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ بھی مسلمانوں کو کامل محبت ہو کیونکہ ابھی معلوم ہوا کہ پوری اطاعت اُسوقت تک نہیں ہوسکتی کہ کامل طور پر محبت نہ ہو اور حق تعالیٰ نے اپنی اطاعت کو آنحضرت ﷺ اللہ کی اطاعت میں منحصر فرمادیا اِس سے ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ نے ان آیات میں اُن لوگوں کو جو محبت الٰہی کا دعویٰ کرتے ہیں اشارۃً یہ حکم فرمادیا کہ جس طرح ہمارے ساتھ محبت رکھتے ہو ہمارے نبی ﷺ کے ساتھ بھی پوری محبت رکھو جسکے آثار نمایاں ہوں یعنی اُنکی پوری اطاعت کرو اور اگر اطاعت نہ کی تو ہماری محبت کے دعوے میں جھوٹے سمجھے جائیں گے۔

غرضکہ آنحضرت ﷺ کی محبت دین میں ضروری سمجھی گئی ہے اسی وجہ سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو آپ سے کمال درجہ کی محبت تھی جیسا کہ شفا میں قاضی عیاض رحؒ نے لکھا ہے۔کہ کسی نے حضرت علی کرم الہ وجہ سے پوچھا کہ صحابہ کی محبت آنحضرت ﷺ کے ساتھ کیسی تھی فرمایا ٹھنڈے پانی کے ساتھ جو کمال تشنگی کے وقت محبت ہوتی ہے۔اِس سے بھی زیادوہ تر تھی اس

میں لکھا ہے کہ ایک بار عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پاؤں سن ہو گیا۔ کسی نے کہا جسکے ساتھ آپ کو زیادہ محبت ہو اُسکو یاد کیجئے اچھا ہو جائے گا۔ یہ سنتے ہی یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر چیخ ماری۔

مواہب لدنیہ میں روایت ہے کہ ایک روز ایک انصاری نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی قسم آپ کی محبت میرے دل میں اپنے جان و مال اہل و اولاد سے زیادہ ہے اگر میں حاضر خدمت ہو کر دیدار سے مشرف نہ ہوں تو یقین ہے کہ مر جاؤں گا۔ یہ کہہ کر رونے لگے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رونے کی وجہ دریافت کی عرض کیا مجھے خیال آیا جب آپ انتقال فرمائیں گے اور میں بھی مر جاؤں گا تو آپ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مقامات عالیہ میں تشریف فرما ہوں گے اور ہم اگر جنت میں گئے بھی تو نیچے کے درجہ میں رہیں گے پھر آپ کا دیدار کیونکر نصیب ہو گا یہ سنکر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے اُسیوقت یہ آیہء شریفہ نازل ہوئی ''وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا''۔ یعنی جو لوگ خدا اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں وہ انبیاء و صدیقین اور شہدا اور صالحین کے ساتھ ہوں گے اور اسمیں یہ روایت

بھی ہے کہ جنگ احد کے روز آنحضرت ﷺ کی شہادت کی خبر مدینہ طیبہ میں مشہور ہوگئی یہ سنتے ہی گوشہ نشین عورتیں گھروں سے نکل پڑیں چنانچہ قبیلہ انصار کی ایک بی بی نے دیکھا کہ اپنے بھائی اور باپ اور شوہر کی لاشیں پڑی ہوئی ہیں مگر اُس خبر وحشت اثر کی وجہ سے اُنہوں نے اُنکی کچھ پروانہ کی اور ایک ایک سے پوچھتی تھیں کہ حضرت ﷺ کہاں ہیں جب اُنہوں نے حضرت ﷺ کو دیکھا تو بے اختیار دامن مبارک کو تھام کر کہنے لگیں یارسول اللہ ﷺ جب آپ سلامت ہیں تو مجھے اب کسی کے مرنیکی کچھ پروانہیں۔ اور اسمیں یہ روایت ہے کہ ایک بی بی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوکر کہنے لگیں کہ آنحضرت ﷺ کی قبر مجھے دکھلائیے جب آپ نے دکھلایا تو دیکھتے ہی اُن کا حال یہ ہوا کہ روتے روتے بیہوش ہوگئیں اور انتقال کر گئیں۔

مواہب لدینہ میں ایوب سختیانی کا حال لکھا ہے کہ جب مجلس میں آنحضرت ﷺ کا ذکر ہوتا تو وہ اتنا روتے کہ بیخود ہوجاتے۔ علامہ رزقانیؒ نے اُس کی شرح میں لکھا ہے کہ امام مالکؒ اپنے شاگردوں سے فرماتے تھے کہ جن محدثین سے میں روایت کرتا ہوں اُن سب میں ایوب افضل تھے میں نے اُنکے ساتھ دو حج کیئے۔ پہلے صرف اُنکو دیکھا کرتا کوئی روایت

نہ لیتا اُنکی حالت یہ تھی کہ جب آنحضرت ﷺ کا ذکر کرتے تو اسقدر روتے کہ مجھے اُن پر رحم آتا تھا۔ جب اُن کی یہ حالت دیکھی اور اسقدر عظمت اُن کے دل میں پائی اُن سے روایتیں لینا شروع کیا۔

مصعب ابن عبداللہ کہتے ہیں کہ امام مالکؒ جب آنحضرت ﷺ کا ذکر کرتے چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا جس سے حضار مجلس کے دلوں پر اثر پڑتا تھا کسی نے اُن سے یہ حالت بیان کی فرمایا جو میں نے دیکھا ہے اگر تم دیکھتے تو اسکا انکار نہ کرتے میں نے محمد بن منکدر کو دیکھا ہے کہ جب اُن سے کوئی حدیث پوچھی جاتی تو اتنا روتے کہ پوچھنے والے کو رحم آجاتا۔

مواہب میں لکھا ہے کہ امام جعفر صادقؓ باوجودیکہ نہایت خوش طبع تھے اور بہت ہنستے تھے مگر جب آنحضرت ﷺ کا ذکر مبارک آجاتا تو چہرے کا رنگ زرد ہو جاتا۔ عبدالرحمن بن قاسم جو محمد بن ابی بکرؓ کے پوتے ہیں جب آنحضرت ﷺ کا ذکر سنتے تو اُنکا رنگ ایسا ہو جاتا کہ گویا جسم سے خون نکل گیا۔ اور زبان خشک ہو جاتی تھی انتہیٰ۔

اِن روایات کے سوا اور بہت سی روایتیں کتب سیر وغیرہ میں مروی ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ اکابر دین کو آنحضرت ﷺ کے ساتھ جو محبت تھی خارج از بیان ہے یہی وجہ تھی کہ اتباع اور اطاعت اعلیٰ درجہ کی ان حضرات

پر آسان ہوگئی تھی ۔ اسی اتباع کی بدولت وہ حضرات اللہ تعالیٰ کے محبوب ہوگئے ۔ حدیث شریف میں وارد ہے ادبوا اولادکم علی خصال ثلاث علی حب نبیکم وحب اهل بیه وعلی قراءة القرآن الحدیث رواه الدیلمی فی الفردوس عن علی رضی الله تعالیٰ عنه۔

یعنی اپنی اولاد کو تین چیزوں کی تعلیم کروا پنے نبی ﷺ اور اُن کے اہل بیت کی محبت اور قرآن کا پڑھنا ۔ ظاہراً محبت کی تعلیم کی یہی صورت معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ﷺ کے پورے پورے فضائل وکمالات ذاتی اور ہماری احتیاج آپ کے ساتھ اور آپ کا ہر مصیبت میں ہماری دستگیری فرمانا وغیرہ امور لڑکوں کو تعلیم کئے جائیں جس سے اُن کی نشو ونما حضرت ﷺ کی محبت کے ساتھ ہو اور قاعدہ ہے کہ اُسی وقت کی تعلیم کا اثر طبیعت میں راسخ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ کی روش عادتیں کو اختیار کرتا ہے ۔ ابن تیمیہؒ نے ''الصارم المسلول'' میں لکھا ہے ''الایمان وان کان اصله تصدیق القلب فذلک التصدیق لا بد ان یوجب حالاً فی القلب وعملاً له وهو تعظیم الرسول واجلا له محبته و ذلک امر لا زم کالتا لم والتغم عندالا حاس

بالمولم والمنعم ''یعنی اگرچہ کہ ایمان کا اصل تصدیق قلبی ہے مگر اُس کے ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ دل میں نبی ﷺ کی تعظیم اور اجلال اور محبت پیدا ہواور یہ امر لازمی ہے جس طرح کوئی دکھ دینے والی چیز کے احساس سے درد اور لذت دار چیز کے احساس سے لذت پیدا ہوتی ہے۔

وقال ایضاً فیه ان الله سبحانه اوجب لنبینا ﷺ علی القلب واللسان والجوارح حقوقاً زائدۃً علے مجردالتصدیق بنبوته کما اوجب سبحانه علی خلقه من العبادات علی القلب واللسان والجوارح اموارزائدۃ علی مجرد التصدیق به سبحانه و حرم سبحانه و حرم رسوله ما یباح ان یفعل مع غیره امورازائدۃ علی مجر دالتکذیب بنبوته ومن حقه ان یکون احب الی المومن من لفسه وولده وجمیع الخلق کما دل علی ذالك قوله سبحانه قل ان کان آباؤکم وابناؤکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموها وبخارة تخشون کسادها ومساکن ترضونها احب الیکم من الله ورسوله۔

یعنی بن تیمیہؒ نے صارم مسلول میں یہ لکھا ہیکہ جس طرح خدائے تعالیٰ نے علاوہ مجرد تصدیق کے اپنی عبادت لوگوں کے دلوں اور زبانوں

اور جوارح پر مقرر کی ہے اسیطرح نبی ﷺ کے حقوق لوگوں کے دلوں اور زبانوں اور جوارح مقرر کیئے ہیں جو علاوہ تصدیق نبوت کے ہیں اور کئی امور ایسے جو دوسروں کے ساتھ جائز ہیں۔ نبی ﷺ کی حرمت کیوجہ سے وہ حرام کردئے گئے جس طرح تکذیب آپکی حرام ہے منجملہ اور حقوق کے ایک حق آپ کا یہ ہے کہ آپکی محبت اپنی جان اور اولاد اور جمیع خلق سے زیادہ ہونی چاہیئے جیسا کہ قرآن شریف سے ثابت ہے۔

ابن تیمیہؒ نے الصارم المسلول میں لکھا ہے ان اللہ فرض علینا تعزیر رسولہ وتو قیرہ ونصرہ ومنعہ وتو قیرہ واجلالہ وتعظیمہ یعنی حق تعالیٰ نے ہم پر رسول ﷺ کی تعظیم وتو قیرہ فرض کی ہے اور نیز ابن تیمیہؒ نے اُس میں لکھا ہے فقیام المدحتو الثناء علیہ والتعظیم والتوقیر لہ قیام الدین کلہ وسقوط ذالک سقوط الدین کلہ یعنے مدح وثناء وتعظیم وتو قیر آنحضرت ﷺ کی کرنا ہے دین کو قائم کرنا ہے اور اس کو دین کو ساقط کر دینا ہے۔

الحاصل جسطرح محبت آنحضرت ﷺ کی واجب ہے اسیطرح حصرت ﷺ کی تعظیم وتو قیر ومدح وثنا بھی واجب بلکہ فرض ہے۔

اسلام

بحث اسلام کے معنے میں۔

اسلام بمعنی انقیاد و گردن نہادن ہے۔ کما فی لسان العرب الا سلام و لا ستسلاما لا نقیا د اور نیز بمعنی تفویض ہے جیسا کہ منتہی الارب میں ہے اسلم امرہ الی اللہ ای سلمہ و قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اسلمت نفسی الیک ای فوضت۔

تمہید ابو شکور میں لکھا ہے کہ بعض فقہا ایمان و اسلام میں فرق کرتے ہیں۔ اور شیعہ کا قول بھی یہی ہے وہ کہتے ہیں کہ جو شرایع کو ادا کرے اور علوم تاویل و تنزیل کو نہ جانے وہ مسلم ہے۔ اور مومن وہ ہے جو حقایق تاویل کو جانتا ہو۔

معتزلہ کے نزدیک ایمان باطن میں ہے اور اسلام ظاہر میں۔ گناہ کبیرہ سے آدمی ایمان سے نکل جاتا ہے اور اسلام سے نہیں نکلتا اسلئے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے قالت الا عراب آمنا قل لم تو منو اولکن قولو ااسلمنا ۔اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایمان اور اسلام میں فرق کیا ہے چنانچہ ایمان کے باب میں فرماتے ہیں اِنْ تُوْمِنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ الخ اور اسلام کے باب میں اِقَامَۃِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءَ الزَّکٰوۃِ لیکن عامہ فقہا سے اہل سنت و جماعت کا مذہب یہ ہے کہ ایمان

اسلام۔ معرفت اور توحید میں اگرچہ باعتبار لغت کے فرق ہے لیکن حقیقۃً کچھ فرق نہیں اسلیئے کہ جس میں یہ چاروں صفتیں ہوں وہ مسلمان ہے۔ اور جس میں ایک صفت بھی نہ ہو وہ کافر ہے انتہیٰ۔

ملا علی قاریؒ نے شرح فقہ اکبر میں لکھا ہے الاسلام ھو التسلیم ای باطناً والانقیا دلا وامر اللہ تعالیٰ ای ظاھراً ففی طریق اللغة فرق بین الایمان والاسلام ولکن لا یکون ایمان بلا اسلام والاسلام بلا ایمان فھما کالظھر مع البطن والدین اسم واقع علی الایمان والاسلام والشرائع کلھا۔ یعنے اسلام تسلیم باطنی اور انقیاد ظاہری کا نام ہے اگرچہ باعتبار لغت کے ان دونوں میں فرق ہے۔ لیکن نہ ایمان بغیر اسلام کے ہوسکتا ہے نہ اسلام بغیر ایمان کے وہ دونوں ایسے ہیں جیسے ظاہر باطن کے ساتھ اور دین کا اطلاق ایمان اور اسلام اور کل شرائع پر ہوتا ہے۔

شرح مقاصد میں لکھا ہے کہ اسلام دین کے معنی میں مشہور ہو گیا ہے اور لفظ ایمان مسلمان کے فعل قلبی کے نام سے اسی وجہ سے ایمان کے متعلقات بیان کرنے کی ضرورت ہے مثلاً خدائے تعالیٰ اور انبیاء و کتب وغیرہ پر ایمان لانا کما قال لا شتھا رلفظ الاسلام فی طریقة

النبی ﷺ واعبتا رالا ضا فة الیه حتی صار بمنزله اسم لدین محمد ﷺ فلفظ الایمان فی فعل المومن من حیث الا ضا نة الیه ولم یصر بمنزلة الا سم للدین و ولهذا کثیر اما یفتقر فی الا یمان الی ذکر المتعلق مثل امنو ابالله ورسوله وغیر ذلک بخلاف الاسلام بحث تصدیق ومعرفت سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ کفار کو معجزات وغیرہ دلائل سے یقین واذعان اِس امر کا ہوجاتا تھا کہ آنحضرت ﷺ نبی ہیں۔ اور قرآن شریف کلام الٰہی ہے۔ مگر استکبار وغیرہ اسباب سے بعض اپنے کفر پر مصر رہتے اور بعض اُس اذعان کی بنا پر تصدیق کر کے مشرف باسلام ہوجاتے ہر چند اذعان اور یقین دونوں ایک ہی قسم کے ہوں مگر اہل اسلام تمام موانع کو دفع کر کے زبان اور دل سے اقرار اور تصدیق کرتے ہیں اور انقیاد و فرمان برداری قبول کر کے اپنی ذات کو خدا اور رسول کے تفویض کر دیتے ہیں کہ جس طرح چاہیں اُس میں تصرف کریں اس لئے کہ جن اعضا وقویٰ کے حرکات وسکنات میں انسان کے اختیار کو دخل ہے۔ اُن میں شارع کا تصرف بھی نافذ ہے کہ بعض حرکات وسکنات سے وہ روک دئے جائیں اور بعض عمل میں لائیں تا معلوم ہوجائے کہ تصرف شرعی کو پوری طور پر قبول کرتے ہیں یا نہیں مثلاً

ہاتھ پاؤں سے جو کام متعلق ہیں اُن میں یہ حکم ہے کہ برے کام کے طرف ہاتھ نہ بڑہائیں اور چل کر نہ جائیں زبان کو بدگوئی وغیرہ سے محفوظ رکھیں۔ علیٰ ہذا القیاس سماعت، بصارت، شکم، فرج وغیرہ اعضا کو چند قسم کے افعال وحرکات سے روکنے اور چند افعال کرنے کا حکم ہے۔ اسی طرح قوای باطنی مثل خیال وغیرہ کو برے کاموں سے متعلق نہ کرنے اور اچھے کاموں سے متعلق کرنے کا حکم ہے۔ جنکی تفصیل علم فقہ واخلاق میں مذکور ہے۔

غرضکہ حق تعالیٰ نے انسان کو جن اعضا وقویٰ پر تصرف دیا اُن میں آزمایش کے لئے اپنا بھی تصرف شرعی لگا رکھا ہے۔ اگر اس تصرف کو قبول نہ کریں تو نافرمانی کا الزام عائد ہوگا۔ جس سے اپنا سراپا اور ظاہر و باطن کو اپنے خالق کے تفویض کر دینا صادق نہ آئیگا حالانکہ اُسکی ضرورت ہے حق تعالیٰ سبحانہ فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ۔یعنے اللہ تعالیٰ نے خرید لیا ہے مسلمانوں کی جان ومال کو بدلہ میں اسکے کہ ان کے لئے جنت ہے جب مسلمان جان ومال سے بک گئے تو اُنکے تسلیم کر دینے میں کیا تامل۔

الحاصل مقتضائے ایمان بھی ہے کہ آدمی اپنی جان ومال خدا اور رسول کو تسلیم وتفویض کر دے جس سے اسلام کے پورے معنی صادق آجائیں۔

یہی وجہ تھی کہ صحابہ آنخضرت ﷺ سے کیسی ہی خلاف قیاس بات سنتے فوراً اُسکو تسلیم کر لیتے تھے۔اور کیونکر نہ کرتے اُنکی عقل نے تو ہر روز معجزات دیکھ دیکھ کر یقین کر لیا تھا کہ خدائے تعالیٰ کی قدرت ہماری عقول کی پابند نہیں آنخضرت ﷺ کا جسم مبارک سے آسمانوں پر تشریف لیجانا، عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا ، موسیٰ علیہ السلام کا دریا کو عصا مار کر جدا کر دینا، ابرہیم علیہ السلام کے روبرو پرندوں کا زندہ ہونا، جنات وملائکہ کو چھپنے اور ظاہر ہونیکی قدرت عطا ہونا، اس جسم سے حشر کے روز اٹھنا وغیرہ امور جو قرآن شریف میں مذکور ہیں اور وہ امور جنکی آنخضرت ﷺ نے خبر دی ہے گو معمولی عقل نہ مانے۔مگر خدائے تعالیٰ کی قدرت میں کوئی بڑی بات نہیں۔الغرض جسکو اسلام کا دعویٰ ہے تو ضرور ہے کہ ظاہر و باطن کے ساتھ عقل کو بھی تسلیم خدا ورسول ﷺ کر دے۔ورنہ اسلام کے ساتھ ایمان کو بھی خیر باد کہہ دینا پڑے گا کیونکہ تقریر بالا سے ظاہر ہے کہ اسلام گویا عین ایمان ہے۔اور نیز اس آیۂ شریفہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے

”کما قال اللہ تعالیٰ فی قصّۃ ابراھیم علیہ السلام یا بُنَیَّ اِنّیٓ اَریٰ فِی الْمَنَامِ اَنّیِٓ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَریٰ قَالَ یَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیٓ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ مِنَ الصَّابِرِیْنَ فَلَمَّا اَسْلَمَا

وَ تَلَّہٗ لِلْجَبِیْنَ وَنَادَیْنَاہُ اَنْ یَّا اِبْرَاھِیْمَ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّوْ یَا ‘‘یعنے ابراہیم علیہ السلام نے کہا اے میرے پیارے فرزند میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں تو تم غور کرو کہ کیا مناسب سمجھتے ہو۔ کہا اے پدر مہربان جو آپ کو حکم ہوا ہے اِسکی تعمیل کیجئے مجھے بھی آپ انشاء اللہ تعالیٰ صابروں میں پاؤ گے۔ پھر جب دونوں نے حکم مانا اور پچھاڑا ابراہیم علیہا لسلام نے اُنکو ماتھے کے بل اور ہمنے اُنکو پُکار کر کہا اے ابراہیم تم نے سچ کر دکھایا اپنا خواب۔ انتہیٰ

دیکھئے فَلَمَّا اَسْلَمَا آواز بلند کہہ رہا ہے کہ اسلام اسے کہتے ہیں کہ ادھر پدر مشفق اپنے جگر گوشہ کو ذبح کرنے پر مستعد خنجر بکف ہیں اور ادہر ہونہار نوجوان فرزند اپنے نازک گلے کو خنجر براں کے تلے رکھ کر کہہ رہے ہیں کہ اے حضرت امتثال امر میں دیر نہ کیجئے۔ اور یہ خیال تک نہیں کہ آخر جرم ہی کیا ہے جسکی سزا دی جارہی ہے نہ طبیعت میں یہ خلجان کہ خواب کی باتوں پر تشدد کیسا کسی کی معمولی عقل یہ ہرگز قبول نہیں کرسکتی کہ بے گناہ نوجوان لڑکا یوں ذبح کیا جائے مگر سبحان اللہ کیا اسلام تھا کہ صاحبزادے نے باوجود استمزاج و مشورہ لینے، یہ بھی نہ کہا کہ حضرت خواب کے لئے تعبیر بھی ہوا کرتی ہے جیسے دودھ کی تعبیر علم ہے آخر آپ نے یہی دیکھا کہ ذبح

فرمارہے ہیں یہ ایک واقعہ ہے حکم الٰہی نہیں جس کی تعمیل ضروری ہو۔ بات یہی تھی کہ حضرت اسمعیل علیہ السلام نے قرینہ گفتگو سے معلوم کرلیا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اِس خواب کی بنا پر ذبح کرنا منظور ہے اسلئے نبی علیہ السلام کے خلاف مرضی چوں وچرا کرنے کی مجال نہ پاکر اپنے ظاہر وباطن اور عقل کو تسلیم کر دیا۔

اب دیکھئے کہ اسلام کیسی چیز ہے کہ جسکے مقابلہ میں جان بھی کوئی چیز نہیں سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ صحابہ کی یہی حالت تھی کہ کیسی کیسی سختیاں اُن پر مخالفین اسلام ڈالتے تھے۔

عرب کی وہ سخت دھوپ جس میں زمین پر پاؤں رکھنا مشکل ہے۔ اِسی دھوپ میں گرم پتھر پر برہنہ لٹا کر چھاتی پر پتھر رکھتے اور اقسام کے عذاب دیکر مجبور کرتے تھے کہ اسلام چھوڑ دیں مگر اُن شیفتگان اسلام پر اُسکا ذرا بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔ بخلاف اِس کے اِس زمانہ میں بعض اُن لوگوں کی یہ حالت ہے کہ جان و مال کا خطرہ تو درکنار، صرف اِس احتمال پر کہ مخالفین اسلام کی موافقت میں اپنی دنیوی ترقی ہوگی اور شاید مخالفت ملت مانع ترقی ہو، مخالفین کی ہاں میں ہاں ملادی تا کہ مذہبی تعصب کا الزام جاتا رہے اور کروڑہا مسلمان قرنا بعد قرن جن اعتقادات پر چلے آرہے ہیں اور

یہ عملدرآمد لاکھوں کتابوں سے ثابت ہوتا ہے اُسکا کچھ اعتبار نہیں کیا اور تدبیر یہ نکالی کہ فقہ وغیرہ خدا ورسول ﷺ کا کلام نہ ہونیکی وجہ سے قابل التفات نہیں ۔ رہی حدیث سووہ متواتر نہ ہونیکی وجہ سے بیکار ہے البتہ قرآن شریف متواتر ہے مگر اُسکی تفسیر جو مفسرین ومحدثین وسلف نے کی ہے وہ سب ڈھکوسلے ہیں قابل اعتبار وہ تفسیر ہے جو ہم کرتے ہیں ۔اب تفسیر کی حالت سنئے ۔ پہلے چند قواعد اپنے مطلب کے تراشے منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ جو مضمون قرآن کا خلاف عقل ونیچر ہو اُس میں تاویل کی ضرورت ہے پھر جو چاہا معنے لکھدیا اور وہ قرآن ہی نہ رکھا جس پر تیرہ سو برس سے مسلمانوں کا عملدرآمد تھا اگر سچ پوچھئے تو قطع نظر اعتقادی بات کے اِس نئے قرآن پر ایمان لانے کی خود ضرورت نہ رہی اسلئے کہ ایمان کی ضرورت تو جب ہو کہ کوئی بات اُسمیں خلاف عقل ہو جو قائل کے اعتماد پر مانی جائے ۔ جب سرے سے کوئی بات بھی ایسی نہیں تو اب ایمان کی ضروت ہی کیا۔ یہ تفسیر بلا مبالغہ ایسی ہے جیسے کافیہ کی شرح اسطرح سے کیجائے قولہ الکلمۃ لفظ وضع لمعنی مفرد اقول کلمہ سے کلمہ طیبہ مراد ہے یعنے لا آلـہ الا اللہ جو صرف توحید وتفرید کے واسطے وضع کیا گیا ہے جسکے معنی مفرد ہیں یعنے ذات بحث جسکا کوئی شریک نہیں قولہ وھی اسم وفعل وحرف واقول

ضمیر ہی کلمہ کی طرف راجع ہے لیکن **علی سبیل الاستخدام** کلمہ سے مراد یہاں ماسوا اللہ ہے۔ ماسوی اللہ کو کلمات اس واسطے کہتے ہیں کہ سب لفظ کن سے پیدا ہوئے ہیں۔ ماسوی اللہ تین قسم پر ہیں اسم یعنی ذات مع الوصف فعل توحید افعال کے لحاظ سے کل افعال جو عالم میں وجود میں آتے ہیں۔ افعال الٰہی میں فعل کا دوسرا مرتبہ اسلئے ہوا کہ افعال کے مناشی صفات ہیں جو اسم میں ملحوظ ہیں اصطلاحات صوفیہ میں اسکی تعریف یہ ہے **الصورة المعلومة فی عرصة العلم الالهی قبل الضبا غها با لوجود العینی کذالک فی کشاف الاصطلاحات** پھر حروف دو قسم پر ہیں حروف عالیات وسافلات۔ حروف عالیات شیون ذاتیہ کو کہتے ہیں جو علم غیب میں کامن میں جیسے شجرہ نواۃ میں کما قیل۔ **کنا حروفاً عالیات لم تقبل متعلقات فی ذری اعلی القا**۔ چونکہ توحید تین قسم پر ہے توحید ذات جو کلمہ شہادت سے معلوم ہوئی اور توحید صفات جو اسم سے معلوم ہوتی ہے اور توحید افعال جو فعل کا مدلول ہے اِس لئے مصنفؒ نے تینوں توحیدوں کو علی الترتیب بیان کر کے حروف کو سب کے آخر میں ذکر کیا الخ۔

اب غور کیجئے اس قسم کی شرح یا تفسیر کو مصنف کی مراد سے کچھ بھی تعلق

ہے۔ بیش ازیں نیست کہ طبیعت آزمائی اور دل لگی خوب ہوگی اسیطرح ان تفسیروں کا حال ہے جو اِس آخری زمانہ میں اپنی رائے سے لکھی جاتی ہیں۔

الغرض عقل سے خدا ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا مقابلہ کرنا اوراپنی عقل کو ترجیح دے کرنصوص قطعیہ کا انکار کر جانا، نہ تفویض ہے نہ انقیاد، پھر معلوم نہیں کہ اسلام کے کیا معنے لئے جاتے ہیں۔ بہرحال تسلیم وانقیاد مذکورہ بالا کا نام اسلام اور اُنکا حصول بغیر کامل تصدیق کے مکن نہیں اسیطرح کامل تصدیق کے بعدوہ دونوں ضرورحاصل ہونگے اس سے یہ بات ثابت ہے کہ ایمان واسلام میں تلازم ہے۔

یہاں یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ تصدیق صرف اخبار سے متعلق ہے انشائیات میں نہیں ہوا کرتی مثلاً کسی کام کا کسی کوحکم کریں اوروہ تصدیق کر کے کہے کہ آپ سچ کہتے ہیں تو بے موقع سمجھا جائیگا پھرایمان واسلام میں تلازم کیونکر ہو، جواب اس کا شرح مقاصد میں لکھا ہے کہ اوامر نواہی کی تصدیق اِس طور پر ہوگی کہ وہ سب حق اور من جانب اللہ ہیں۔ اوراخبار کے منقاد ہونے کی یہ صورت ہے کہ گووہ خلاف عقل ہوں اُنکے ماننے اور تسلیم کرنے پر عقل مجبور کیجائے جیسے اعضا اوامر ونواہی کے انقیاد پر مجبور کیئے جاتے ہیں۔

اگر کہا جائے کہ احادیث سے ایمان واسلام میں فرق ثابت ہے اس

لئے کہ شارع علیہ السلام نے نماز روزہ وغیرہ اعمال جوارح کو اسلام قرار دیا ہے اور ایمان فعل قلبی کو۔

اسکا جواب یہ ہے کہ نصوص قطعیہ سے ثابت ہے کہ منافق کفار سے بھی بدتر ہیں حالانکہ یہ افعال برابر اُن سے صادر ہوتے تھے۔ اُس سے ظاہر ہے کہ صرف اعمال اسلام کے لئے کافی نہیں انقیاد معنوی اس کے لئے ضرور ہے۔ البتہ ایمان و اسلام میں فی الجملہ یہ فرق ہوسکتا ہے کہ اسلام کا بالذات تعلق اکثر افعال جوارح سے ہے اور ایمان صرف فعل قلبی ہے اِس مقام میں یہ بھی اعتراض کیا جاتا ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے وَقَالَتِ الْاَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا یعنی بدوں نے کہا لو ہم ایمان لائے اُن سے کہئے کہ تم ایمان نہیں لائے یوں کہو کہ اسلام لائے۔ اِس سے ثابت ہے کہ دونوں میں تلازم نہیں۔

اِسکا جواب یہ کہ اسلام کا لفظ کبھی صلح میں داخل ہونے کے معنی میں بھی آتا ہے جیسا کہ لسان العرب میں لکھا ہے چونکہ اُن لوگوں کا اصلی منشا صلح کرنے کا تھا اور برائے نام آمنا کہتے تھے اسلئے ارشاد ہوا کہ تم کو ایمان سے کیا تعلق تم تو صلح میں داخل ہونا چاہتے ہو اِسلئے اَسْلَمْنَا کہو یعنے دخلنا فی الصلح چنانچہ تفسیر درمنثور میں اس آئیہ شریفہ کی شان نزول

میں لکھا ہے کہ عرب کا ایک قبیلہ حضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور مسلمان ہونے کا احسان حضرت ﷺ پر رکھ کر کہا کہ جیسا فلاں قبیلہ آپ سے لڑا تھا ہم نہ لڑینگے اِس سے ظاہر ہے کہ اُنکو صلح مقصود تھی ۔ الحاصل منافق پر اسلام کا اطلاق نہ ہونے سے ثابت ہوتا ہے کہ عرف شرع میں اسلام مرادف یا مساوی ایمان ہے جس سے متبادر ہے کہ آیۃ موصوفہ میں لفظ اسلام باعتبار عرف شرع مجازی معنی میں مستعمل ہے اور اس آئیہ شریفہ سے بھی معلوم ہوتا ہیکہ اصل اسلام دل سے متعلق ہے قولہ تعالیٰ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ لِلْاِ سْلَامِ فَھُوَعَلٰی نُوْرٍمِّنْ رَّبِّہٖ.

اور اس حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

عن صفوان ابن امیة عن ابیه قال استعارمنی رسول الله ﷺ درعاً من حدید فقلت مضمو نه یا رسول الله قال مضمو نة فضاع بعضها فقال النبی ﷺ وسلم ان شئت غرمتها قلت لا الان فی قلبی من الا سلام غیرما کان یومئذرواه الدارقطنی فی المجتبی ۔

یعنی امیہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فولادی ذرہ مجھ سے مستعار لی میں نے عرض کی کہ اگر وہ تلف ہو جائے تو اسکی قیمت عطا ہوگی فرمایا ہاں

اتفاقاً وہ تھوڑا تلف ہو گیا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر چاہو تو اُسکا تاوان دوں میں نے عرض کی کہ اب ضرورت نہیں آج میرے دل میں وہ اسلام ہے جو اُس روز نہ تھا۔

الحاصل اصل اسلام بھی مثل ایمان دل ہی سے متعلق ہے۔ مگر چونکہ اقوال وافعال سے اسلام ظاہر ہوتا ہے اِس لئے جس سے یہ امور صادر ہوں بحسب ظاہر اُس کو مسلمان کہنا چاہئے۔ چنانچہ امام موفق الدینؒ نے کتاب فضائل امام اعظمؒ میں امام صاحب کا قول نقل کیا ہے کہ تصدیق کے باب میں تین قسم کے لوگ ہیں بعض وہ ہیں کہ خدائے تعالیٰ اور اُسکی طرف سے جو کچھ آیا ہے سب کی تصدیق دل اور زبان سے کرتے ہیں اور بعض صرف زبان سے تصدیق کرتے ہیں اور بعض صرف دل سے جو لوگ زبان و دل سے تصدیق کرتے ہیں وہ اللہ کے نزدیک بھی مومن اور اور لوگوں کے نزدیک بھی. اور جو صرف زبان سے تصدیق کرتے ہیں اور دل سے تکذیب وہ اللہ کے نزدیک کافر اور لوگوں کے نزدیک مومن ہیں اسلئے کہ لوگ نہیں جانتے کہ دل میں کیا ہے۔ اُنکو چاہئے کہ اقرار شہادت کی وجہ سے اُنکو مومن کہیں اور دل کا حال معلوم کرنیکی کوشش نہ کریں اور جو لوگ دل سے تصدیق کرتے ہیں اور بلحاظ تقیہ زبان سے تکذیب کرتے

ہیں وہ اللہ کے نزدیک مومن ہیں اور ناواقف شخص کے پاس کافر انتہیٰ۔
چونکہ کتاب مذکور چھپ گئی ہے اسلئے عبارت اُسکی نقل نہیں کی گئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ کسی کومسلمان کہنے کے لئے اُسکے دل کی کیفیت معلوم ہونا ضرور نہیں اگر اسکی ضرورت ہوتی تو کسی کومسلمان کہنا درست نہ ہوتا جس سے مسلمانوں میں منا کرت بلکہ مخالفت پیدا ہوجاتی اِس لئے شریعت نے حکم دیدیا کہ جس سے اسلام کے اقوال وافعال صادر ہوا ُسکو مسلمان سمجھ لو۔ اوراُس سے مخالفانہ برتاؤ نہ کرو۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰی اِلَیْکُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا یعنے اگرکوئی تم پرسلام کرے تو یہ مت کہو تو مومن نہیں اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی توحید ورسالت کی گواہی دے اور نماز وروزہ وغیرہ ادا کرے تو اُسکے جان ومال سے کوئی تعرض نہیں۔ الغرض بقرینہ ظاہر حال اسلام وایمان باطنی پر حکم کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر کفر پر قرینہ ہوتو بحسب ظاہر کفر کا حکم کیا جائیگا چنانچہ ابن تیمیہؒ نے الصارم المسلول میں لکھا ہے الایمان والنفاق اصله فی القلب وانما الذی یظهر من القول والفعل دلیل علیه فاذاظهر شئی یر تب علیها لحکم ۔شرح مقاصد وغیرہ میں لکھا ہے کہ بعض معاصی کوشارع نے عدم تصدیق کے امارات و

علامات قرار دئے ہیں جیسے نبی ﷺ سے بُغض رکھنا قرآن شریف کو نجاست میں پھینکدینا بت کو سجدہ کرنا وغیرہ امور انتہیٰ۔ اِس سے اہل اسلام سمجھ سکتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ قاعدہ قرار دے کہ جو امور قرآن و حدیث میں خلاف عقل ہوں اُن میں تاویل کرنے کی ضرورت ہے جسکا مطلب یہ ہوا کہ وہ نہ مانے جائیں تو ایسے عقیدہ والے کو کیا سمجھنا چاہئے۔

السیف المسلول میں امام تقی الدین نے لکھا ہے کہ اجماع اس امر پر ہوگیا ہے کہ جو مسلمان آنحضرت ﷺ کی تنقیص شان کرے یا گالی دے اُسکا قتل واجب ہے۔ اور لکھا ہے کہ حضرت عمر نے صاف حکم دیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو یا کسی نبی کو گالی دے اُسکو قتل کر ڈالو اور امام شافعیؒ کا قول ہے کہ جو شخص کسی آیت قرآنی کے ساتھ ہزل اور تمسخر کرے وہ کافر ہو جاتا ہے باعتبار ظاہر ایسے شخص کی تکفیر کا حکم دیا جائے۔

ابن تیمیہؒ نے الصارم المسلول میں لکھا ہے

”قال اصحابنا التعریض بسب اللہ وسب رسولہ ﷺ ردۃ وھو موجب للقتل۔ وایضاً قولہ قال مالک فی روایۃ المدنیین عنہ من سب رسول اللہ ﷺ او شتمہ اور عابہ او تنقصہ قتل مسلما کان او کافراً۔ وایضاً قولہ وان یزعم ان زھذہ لم یکن

قصد ولو قدر علی الطیبات لا کلھا واشباہ ھذا اقال فھذا الباب کلہ مماعد العلماء سبا وتنقیصا یجب قتل قائلہ ولم یختلف فی ذالک متقدمھم متاخرھم وایضاً قولہ ان السّاب ان کان مسلماً فانہ یکفر ویقتل بغیر خلاف وھو مذھب الائمۃ الاربع وغیرھم وقدتقدم ممن حکی الاجماع علی ذٰلک اسحاق بن راھویہ وغیرہ "

ماحصل اِن روایات کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ اور آنحضرت ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والا واجب القتل ہے اگرچہ تنقیص شان کنایتہً ہو۔ اگر کوئی کہے کہ آنحضرت ﷺ کا زہد قصداً نہ تھا۔ اگر عمدہ چیزیں ملتیں تو آپ کھاتے ایسے شخص کا بھی قتل واجب ہے۔

ان روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ ہر چند کوئی اسلام ظاہر کرے مگر جب قرائن مذکور اس میں پائے جائیں تو وہ کافر سمجھا جائیگا اور اسکا یہ کہنا کہ میں مسلمان ہوں یا شعار اسلام اُس سے ظاہر ہوں کچھ مفید نہ ہوگا ۔ یہ صرف ایک آیت کے انکار کا نتیجہ تھا کہ حق تعالے فرماتا ہے وتعزروہ وتوقروہ یعنی نبی کریم ﷺ کی تعظیم وتوقیر کرو، اب خیال کیا جائے کہ جس کسی کو خدائے تعالیٰ کی قدرت میں کلام ہو کہ وہ عادت کے سوا کچھ نہیں کرسکتا ۔ اِس قاعدہ سے کتنے آیات قرآنی کا انکار ہوا جاتا ہے کل معجزات انبیائے

سابق کا۔ حشر ونشر کا ۔ جنت ودوزخ کا۔جن وملائکہ وغیرہ جن کا وجود قرآن شریف سے ثابت ہے جب قرآن کا یہ حال ہوتو حدیث کوکون پوچھے ۔اور جب خداورسول صلی اللہ علیہ وسلم پر تہذیبی پیرایہ میں جھوٹ کا الزام لگایا جائے تو صحابہ اور علماء امت وغیرہم کس قطار وشمار میں پھر باوجود ان تمام انکاروں کے معلوم نہیں کہ اسلام کس چیز کا نام رکھا جاتا ہے ۔

ھدانا اللہ وایاھم سواء السبیل .

اس زمانہ میں مسلمانوں کو اِس قدر ضرور ہے کہ نہ ایسی تفسیریں دیکھیں نہ اس قسم کی تفسیریں سنیں جس سے شک پیدا ہو۔ بلکہ دعا کریں کہ خدائے تعالیٰ ہمکو اور ان کو ہدایت کرے اور وہ ایمان واسلام عطا فرمادے جو باعث نجات اخروی ہے **وماتوفیقنا الاباللہ**۔

یہ بات اوپر معلوم ہوئی کہ ایمان نہ معمولی تصدیق کا نام ہے نہ معرفت کا بلکہ جبتک دس چیزیں نہ ہوں ایمان کا وجود نہیں ہوسکتا ۔ اگرچہ یہ کام نہایت مشکل معلوم ہوتا ہے مگر خدائے تعالیٰ کی طرف سے شرح صدر ہوجاتا ہے تو پھر کوئی دشواری باقی نہیں رہتی ۔ چنانچہ بخاری ومسلم کی اِس حدیث شریف سے ظاہر ہے جسکا ماحصل یہ ہے کہ غزوہ احد میں ایک اعرابی بطورتفریح اِس سادگی سے معرکہ جنگ میں آیا کہ ہاتھ میں کھجوریں

ہیں اور بلا تکلف کھاتے ہوئے تماشا دیکھ رہا تھا کہ یکبارگی دوسرا خیال پیدا ہوا جو باعث ہدایت تھا چنانچہ آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ اگر میں آپکی طرف سے لڑوں تو میرا مقام کہاں ہوگا آپ نے فرمایا جنت میں یہ سنتے ہی کھجوریں پھینک کفار کے لشکر پر حملہ آور ہوا اور داد جوانمردی دیکر مقصود کو پہونچ گیا دیکھئے آنحضرت ﷺ نے صرف خبر دی کہ اگر ہماری طرف سے لڑکر مروگے تو جنت میں داخل ہوجاؤگے نہ کوئی اُنکو معجزہ دکھلانے کی ضرورت ہوئی نہ مناظرہ کی نوبت آئی صرف ایک ہی اشارہ نے وہ کام کیا کہ فوراً اُنہوں نے یہ مان لیا کہ عالم کا ایک خالق ہے جس نے محمد ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا ہے وہ جو کچھ کہتے ہیں صحیح اور اس قابل ہے کہ اگر اُسپر عمل کیا جائے تو سعادت ابدی حاصل ہوتی ہے اور وہ مقام ملتا ہے جو صرف راحت اور عیش کیلئے بنایا گیا ہے گو اُنہوں نے زبان سے کچھ بھی نہیں کہا مگر یہ سب امور اور تصدیقیں اُنکی ایک تصدیق میں شامل ہیں ۔ پھر صرف تصدیق ہی نہیں بلکہ طور پر یہ دکھلا دیا کہ ایمان والے خدا اور رسول ﷺ کے حکم کے بعد نہ اپنی محبوبہ کے بیوہ ہونیکی پروا کرتے ہیں نہ اولاد کے یتیم ہونیکا خیال بلکہ پروانہ کی طرح جان کو فدا کردیتے ہیں ۔ بخلاف اسکے بہت سے لوگ عمر بھر معجزے دیکھا کئے اور پوری معرفت

حاصل تھی کہ حضرت اللہ کے رسول ﷺ ہیں پھر اُسپر حضرت ﷺ نے تر غیبیں بھی دیں کذافی تفسیر ابن جریر وغیرہ ۔اور فرمایا کہ اگرتم ایک کلمہ کہدوگے یعنی لا الٰہ الا اللہ تو تمام عرب تمہارا مطیع ومنقاد ہوجائیگا ۔اور عجم خراج وجزیہ تمہیں دینگے ۔اور یہ یقین بھی تھا کہ حضرت ﷺ کبھی جھوٹ نہیں کہتے باوجود اسکے اُس ایک کلمہ کی تصدیق ان سے نہ ہوسکی اور کہنے لگے اجعل الا لھۃ الھا واحدا ان ھذا لشئی عجاب یعنی تمام معبودوں کو ایک بنادیا یہ عجب بات ہے۔ان کی درایت گویا یہ کہتی کہ اتنے معبودوں سے تو کام چل ہی نہیں سکتا پھر ایک معبود اس تمام عالم کا کام کیونکر چلاسکے اور جن لوگوں نے یہ خیال کرلیا کہ نبی ﷺ جھوٹ تو کہتے ہی نہیں اور انکے دعویٰ رسالت پر معجزات بھی گواہی دے رہے ہیں تو اُنکی تصدیق کرنے میں کیا تامل ۔چنانچہ انہوں نے اُس ایک کلمہ کی کیا اس ایک قسم کی کل باتوں کی تصدیق کرلی اور آپکے قول کے مقابلہ میں عقل کی ایک نہ مانی اور یہی گروہ یوماً فیوماً ترقی کرنے لگا پھر جب اہل ایمان کی ترقی دکھلا کر اُن پابندانِ عقل ودرایت سے کہا کہ تم کیوں نہیں ایمان لاتے تو اُسکے جواب میں اُنہوں نے کہا وہ لوگ بیوقوف ہیں جو خلاف عقل باتوں کا یقین کرلیتے ہیں کیا ہم بھی اُنکی طرح بیوقوف بنیں چنانچہ قرآن

شریف سے اُسکی تصدیق ہوتی ہے کما قال تعالےٰ وَاذا قیل لھم امنوا کما امن الناس قالوا انومن کما امن السفہا غرض ان کی درایت نے اُنکو ایمان سے روکا ۔اور اُس جماعت نے جو اُن پابندان درایت کی دانست میں سفیہ اور احمق تھی اس درجہ ترقی کی کہ اُن عقلا کو اپنا قول واپس لینا پڑا چنانچہ سوائے معدودے چند متعصب لوگوں کے جو ہٹ دھرمی سے اپنی بات پر اڑے رہے ،کل عقلا گروہ اہل ایمان میں شامل ہو گئے اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ فوج فوج ازخود آکر ایمان لانے لگے ۔کما قال تعالیٰ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجاً مگر ہر زمانے کے متعصب کفار مسلمانوں پر یہ الزام لگاتے رہے ہ یہ لوگ خلاف عقل باتوں کو مانتے ہیں ۔اور ایک نہ ایک جماعت اہل اسلام کی اس الزام کے اُٹھا نیکی کوشش میں لگی رہی چنانچہ معتزلہ نے فلسفہ سے مدد لیکر بہت سی آیتوں کی تاویل کرڈالی اور اُنکو عقل کے مطابق کر دیا اور قرآن کو ایسا بنا دیا جیسے کافیہ کی شرح مذکور پھر ہر کہ آمد براں مزید کرد کا مضمون صادق آ گیا یہاں تک کہ اب تو یہ نوبت پہنچی ہے کہ آجکل کے اعتقادات وعملیات کو قرآن وحدیث سے ملا کر دیکھیں تو ہرگز نہ معلوم ہوگا کہ اُن سے کیا تعلق ہے۔اور قرآن تو ایسا بنالیا گیا کہ اب اسپر ایمان لانیکی ضرورت ہی نہ رہی کیونکہ

اُسمیں ایسی بات ہی نہ رکھی جس کے ماننے میں معمولی عقل کوتر دد ہو اور
ایمان کی ضرورت پڑے۔ مثلاً الم ترکیف میں جو مذکور ہے کہ پرندوں نے
بحکم خدائے تعالیٰ ایک لشکر عظیم کو ہلاک کرڈالا جسکے ماننے میں عقل کا
امتحان ہوا تھا کہ خدا اور رسول ﷺ کی بات قابل قبول سمجھتی ہے یا نہیں اور
عقل کو مجبور و مقور کر کے اس پر ایمان لانیکی ضرورت سمجھی جاتی تھی اور اب
اُسکی ضرورت ہی نہ رہی۔ اسلئے اس کا یہ مطلب بنالیا کہ کنکر پتھر یا اور کوئی
بیماری لشکر میں پھیلی تھی جس سے لوگ ہلاک ہوگئے نہ وہاں پرندے تھے نہ
کنکریاں سرے سے وہ قصہ ہی غلط ہے جس پر قدیم زمانہ اسلام سے آج
تک لوگ ایمان لاتے رہے۔ اگر اُن سے کہا جائے کہ جس طرح تیرا سو
سال سے لوگ ایمان لا رہے ہیں تم بھی ایمان لاؤ تو صاف کہا جائیگا
انومن کما آمن السفھاء یعنی کیا پُرانی فیشن والوں کی طرح ہم خلاف عقل
باتوں کا یقین کرینگے ہرگز نہیں چونکہ آجکل کے محاورہ میں پرانی فیشن
والے احمق سمجھے جاتے ہیں اسلئے سفہا کے ترجمہ میں وہ لفظ لکھا گیا ہے۔ ہر
چند اس لفظ کا صدمہ گالی سے کم نہیں مگر ایک جہت سے ہم لوگوں کو خوش بھی
ہونا چاہئے اسلئے کہ آنحضرت ﷺ کے روبرو صحابہ علیھم الرضوان کو عقلا نے
جو لقب دیا تھا وہ لقب آج ہمکو دیا جارہا ہے اور غالباً صحابہ بھی اُس لقب

سے ناراض ہوئے ہونگے اسلئے کہ سفہاء کہنے والوں کی نسبت حق تعالےٰ نے فرمایا اَلَا اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَاءُ وَلٰکِنْ لَّا یَعْلَمُوْنَ یعنے یاد رہے کہ جو اہل ایمان کو سفہاء کہتے ہیں وہی سفہاء ہیں لیکن وہ جانتے نہیں۔ دیکھئے اہل ایمان کی کیسی فضیلت ہے کہ خود حق تعالےٰ نے اُنکو تشفی کیلئے فرمایا کہ جو لوگ تم کو بے وقوف کہتے ہیں دراصل وہی بیوقوف ہیں۔ ظاہراً اس تشفی دینے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آدمی کی فطرت میں داخل ہے کہ سفیہ اور احمق کہنے سے بڑا رنج ہوتا ہے۔ اعلیٰ درجہ کے احمق بلکہ کم عمر لڑکے کو بھی اگر کہا جائے کہ سفیہ اور احمق ہے تو اس کو رنج ہوتا ہے اور حتی الوسع وہ کوشش کرتا ہے کہ یہ لفظ اپنی نسبت نہ کہا جائے چنانچہ یہ امر مشاہد ہے کہ پرانی فیشن کا الزام نہ آنے کی غرض سے کیسی کیسی مصیبتیں اُٹھائی جاتی ہیں اگرچہ نوخیز مشائخین وعلماء وغیرہم کا دل گوارا نہیں کرتا کہ اپنا آبائی لباس اور وضع ترک کریں مگر اُس ڈر کے مارے کہ کوئی یہ نہ کہدے کہ پرانی فیشن والے ہیں مجبوراً لباس بدل دیتے ہیں اور صرف لباس ہی نہیں بلکہ ڈاڑھی کو بھی خیرباد کہدیتے ہیں اور اگر کسی ضرورت کے لحاظ سے ڈارھی رکھ بھی لی تو خاص قسم کی قطع وبرید کرکے تاکہ پرانے لوگ سمجھ جائیں کہ کسی طرح منہ پر ڈاڑھی تو ہے اور اُسی پر قناعت کرلیں اور نئی روشنی کے لوگ بھی چوں چرا نہ

کرسکیں اسلئے کہ وہ فرنچ فیشن ہے جسکی تقلید بھی روشن خیالی سمجھی جاتی ہے غرضکہ سفاہت کا الزام اہل ایمان کو سخت صدمہ ہونیوالا تھا جس سے احتمال تھا کہ وہ شکستہ خاطر ہوکر الزام اٹھانیکی فکر کرینگے اسلئے حق تعالیٰ نے اُنکے حوصلے بڑہانے کیلئے فرمایا کہ تم سفہاء نہیں ہو بلکہ وہی سفہاء ہیں جو تمکو سفیہ کہتے ہیں اِس سے اہل ایمان کو کمال درجہ کا افتخار حاصل ہوگیا کہ سفاہت کو حق تعالیٰ نے اُنہی لوگوں میں منحصر کردیا جو ہمیں سفہاء کہا کرتے ہیں جیسا کہ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَاءُ کی ترکیب سے ظاہر ہے جس سے یہ ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کے نزدیک ہم عقلا ہیں اِسی وجہ سے فَاتَّقُوْنِ یَا اُولِی لْاَلْبَابُ کا خطاب ہوا کیونکہ خدا سے ڈرنیوالے وہی لوگ ہیں جنکا ایمان کامل ہے ورنہ خدا کا خوف تو درکنار جن لوگو پر خوف الٰہی غالب ہوتا ہے اُن سے اِس زمانہ میں تمسخر کیا جاتا ہے۔اور اُن پر بہتان اڑائے جاتے ہیں جس طرح آنحضرت ﷺ کے زمانے میں بھی اہل ایمان کے ساتھ تمسخر کیا جاتا تھا جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا وَیَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ اتَّقَوْا فَوْقَھُمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ یعنے کافروں کو زندگی دنیا کی اچھی معلوم ہوتی ہے اور وہ ایمان والوں کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں اور جو لوگ متقی ہیں

قیامت کے روز اُنکے اوپر ہوں گے یعنی جنت میں ۔اس سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان کیساتھ تمسخر کرنا عقلا کا لازمہ ہے اور ہونا بھی چاہئے اسلئے کہ جب اہل ایمان عقلا کے دانست میں سفہا اور بیوقوف ٹھہرے تو بیوقوفوں کے ساتھ تمسخر کرنے کو خواہ مخواہ آدمی کا جی چاہتا ہے جس سے ایک قسم کا سرور ہوتا ہے اِس موقع میں اہل ایمان کو فراخ حوصلگی سے کام لیکر یہ سمجھنا چاہئے کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہم بحسب وعدہ الٰہی آخرت میں دایمی عیش وعشرت اور فرحت وسرور میں رہیں گے اگر وہ لوگ چندروزہ دنیا میں تمسخر سے اپنا دل بہلالیں اور سرور حاصل کریں تو بے موقع نہ ہوگا کیونکہ آخروہ بھی بندہ خدا ہیں کم سے کم اتنا تو چاہئے کہ اِس عالم میں ہر طرح سے سرور حاصل کریں۔

اب ہم اپنی تقریر کو اِس دعا پر ختم کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ اپنے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے جمیع اہل اسلام کو ایمان کامل عطا فرما کے دارین فائز المرام رکھے آمین یارب العالمین

وَصَلیَ اللّٰه تعالی علی خیر خلقه سیدنا محمد واله واصحابه اجمعین برحمتك یا ارحم الراحمین۔

تمت بالخیر

